صراط علی حق نمسکہ

علی علیہ السلام کا راستہ برحق ہے جسے ہم اختیار کئے ہوئے ہیں

(تفسیر صافی جلد ا صفحہ ۷۸)

علی علیہ السلام کا راستہ

تصنیف

آیۃ اللہ سید رضا صدر

ترجمہ

علامہ محمد علی فاضل مدظلہ العالی

جامعۃ الکوثر۔ اسلام آباد

زیر سرپرستی حضرت **قائم آلِ محمد** عجل اللہ فرجہ الشریف

ناشر :
زیر نگرانی :

نام کتاب :۔ علی عَلَیہِ السّلام کاراستہ

تصنیف:۔ آیۃ اللہ سید رضا صدر

ترجمہ :۔ علامہ محمد علی فاضل مدظلہ العالی

ترتیب وتدوین :۔ سید محمد حسن عسکری

تاریخ اشاعت :۔ جنوری 2019ء

تعداد :۔ 1000

ہدیہ :۔ 200 روپے

پیشکش :۔ جامعۃ الکوثر۔ اسلام آباد

فہرست مطالب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تعارف

حضرت آیۃ اللہ الحاج سید رضا صدر قدس سرہ (۱۳۰۰-۱۳۷۳ شمسی)

عالی مقام فقیہ، زبردست حکیم، علم، تقویٰ اور فقاہت کے نجیب وشریف خاندان کی یادگار ہستی ہیں، مشہد مقدس (ایران) میں ولادت باسعادت ہوئی، ابتدائی تعلیم حوزہ علمیہ مشہد مقدس میں حاصل کرنے کے بعد اپنے والد گرامی حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید صدرالدین صدر-جو اپنے دور کے مراجع میں سے تھے-کے ہمراہ قم مقدسہ میں تشریف لے آئے، دروس سطح اور دروس خارج فقہ، اصول، فلسفہ اور عرفان حوزہ علمیہ قم کے عظیم اساتذہ سے حاصل کئے، جن میں سے خود ان کے والد گرامی سید صدرالدین صدر، مرحوم آیۃ اللہ العظمیٰ حجت، مرحوم آیۃ اللہ العظمیٰ امام خمینی (رحمھم اللہ) ہیں، حصول علم میں سعی مسلسل اور اپنے علمی نبوغ کی وجہ سے مختصر عرصہ میں ان کا شمار حوزہ علمیہ قم کے برجستہ فضلاء میں ہونے لگ گیا، اوراپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے گنتی کے چند علماء میں شمار ہونے لگ گئے،

یہ عالم بزرگوار جہاں اجتہاد کے اعلیٰ مراتب کو پہنچے تھے اور مقام مرجعیت پر فائز ہو چکے تھے اور حوزوی علوم کی تدریس میں مہارت حاصل کر

چکے تھے وہاں بہترین سخنران، پختہ قلم کاراور تحریری میدان میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔

انہی خصوصیات کی بناپر آپ کے اندر علمی اور قلمی آمادگی بھی بدرجہ اتم موجود تھی اور آپ کی طرف سے مختلف علوم میں نہایت گرانقدر علمی آثار موجود ہیں، جو اسلامی آثار کی نمائش کے لئے مناسب نمونہ عمل قرار دیئے جاسکتے ہیں۔

ایک متقی اہل قلم سے پختہ مطالب اگر وسعت علمی اور دیانتداری کے ساتھ مفصۂ شہود پر لائے جائیں تو تشنگان حق و حقیقت کے لئے معرفت کا ایک چشمہ زلال ثابت ہو سکتے ہیں، جس سے وہ اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں۔

مرحوم آیۃ اللہ صدر کے علمی آثار میں یہ خوبیاں واضح طور پر نظر آتی ہیں، جن کی وجہ سے ہم ان میں سے ایک علمی شاہکار کو طبع کرنے کا شرف حاصل کر رہے ہیں اور وہ ہے "راہ علی"[1] (یعنی علی عَلَیہِ السَّلام کا راستہ)

آخر میں ہم دفتر تبلیغات اسلامی قم کے شکر گزار ہیں جو اس علمی آثار کو آپ تک پہنچا رہے ہیں۔

[1] صراط علی حق نمسکہ (تفسیر صافی جلد ۱ ص ۷۸)

عرض مترجم

علی عَلَیہِ السّلام کون ؟وہی کہ جس کے ایمان کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا جائے اور تمام اہل ارض و سماء اور جن و انس کے ایمان کو دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو اس کے ایمان کا پلڑا بھاری نظر آئے گا۔وہی علی عَلَیہِ السّلام کے کہ جس کے ہاتھوں میں پل صراط سے گزرنے کا پروانہ ہے۔وہی علی عَلَیہِ السّلام کہ جس کے چہرے کو دیکھنا عبادت ہے۔وہی علی عَلَیہِ السّلام کہ جو حضرت آدم عَلَیہِ السّلام سے حضرت خاتم صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَآلِہِ وَسَلَّم تک تمام انبیاء کی شبیہ ہے۔وہی علی عَلَیہِ السّلام جو نفس رسول ہے۔

وہی علی عَلَیہِ السّلام جو باب مدینۃ العلم ہے۔

وہی علی عَلَیہِ السّلام جو صدیق اکبر اور فاروق اعظم ہے۔

وہی علی عَلَیہِ السّلام جو ہمائے رحمت ہے

وہی علی عَلَیہِ السّلام جو اللہ کی عظیم آیت ہے

وہی علی عَلَیہِ السّلام جو خالق کائنات کی عظیم خبر ہے۔

وہی علی عَلَیہِ السّلام کہ جس کا طرز زندگی منافقت کی موت ہے۔

اسی علی عَلَیہِ السّلام کی بارگاہ اقدس میں اپنا ایک حقیر سا نذرانہ لے کر حاضر ہوا ہوں، تاکہ اسے قبول فرمائیں، بروز حشر میری شفاعت اور پل صراط کے عبور کے وقت پروانہ نجات عطا فرمائیں۔

زیر نظر کتاب "علی کا راستہ "جو ترجمہ ہے "راہ علی"کا تصنیف ہے حضرت آیۃ اللہ مرحوم سید رضا صدر کی اور جسے دفتر تبلیغات حوزہ علمیہ قم نے شائع کیا ہے۔"الدال علی الخیر کفاعلہ" کے مصداق اس کتاب کے ترجمہ کے لئے حضرت آیۃ اللہ شیخ محسن علی نجفی دامت برکاتہ نے رہنمائی فرمائی ہے، انہوں نے فرمایا کہ کتاب کی افادیت اس قدر ہے کہ اسے ہر خاص وعام تک پہنچنا چاہیے، میں نے اس کے لئے حامی بھر لی اور الحمد للہ کہ آج یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

کتاب کی افادیت کا اندازہ آپ کو اس کے مطالعہ کے بعد ہی ہو گا، اس لئے کہ "علی کا راستہ" سربراہان مملکت کے لئے مشعل راہ ہے کہ فرمانروائی کس طرح کی جاتی ہے۔ سریر آرائے محکمہ عدالت کے لئے راہنما ہے کہ قاضی (جج) کو کیونکر فیصلے کرنا چاہئیں۔

عسکری قوتوں کے سربراہوں کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے کہ جنگ کیونکر کی جاتی ہے اور جنگ کا آغاز کیسے کیا جائے؟ اور قیدیوں سے کس طرح سلوک کیا جاتا ہے؟

غرض زندگی کے ہر لمحہ کے لئے علیؑ کے راہنما اصول موجود ہیں جن پر عمل درآمد کر کے انسان دنیا اور آخرت دونوں میں سعادت حاصل کر سکتا ہے۔

علی علیہ السلام کا راستہ

مقدمہ مؤلف

حضرت علی علیہ السلام آسمان بشریت کے چمکتے ستارے اور نوع انسانی کے لیے چراغ ہدایت ہیں۔ انسانیت کی نگاہ جتنی بلند ہوتی جائے گی اور بصیرت بڑھتی جائے گی اتنا ہی حضرت علی علیہ السلام کی درخشندہ شخصیت کو بہتر دیکھ سکے گی۔

آج کی دنیا کے لوگ چاہے وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، پارسی ہوں یا عیسائی اور یہودی، سب علی علیہ السلام کو بہتر جانتے اور پہنچاتے ہیں۔ جبکہ ماضی میں ایک لمبے عرصے تک کچھ لوگ منبر پر بیٹھ کر علی کو گالیاں دیتے تھے اور سبّ و شتم کرتے تھے۔ جبکہ دوسرے لوگ غیر جانبدار بن کر سنتے اور چپ سادھے رہتے تھے۔

"علی علیہ السلام کی معرفت" عالم انسانیت کے لیے باعث سعادت ہے حق تو یہ ہے کہ دنیا کی جامعات (یونیورسٹیوں) میں ایک شعبہ "علیؑ شناسی" کے نام سے قائم ہونا چاہیے تاکہ محققین اور دانشور حضرات اس موضوع پر تحقیق کریں شاید کہ وہ علی علیہ السلام کو خود بھی بہتر سمجھ سکیں اور دوسروں کو بھی بہتر سمجھا سکیں۔

اگر ایسا ہو جائے تو یقین جانیئے کہ یہ انسانیت کے حق میں ایک ایسی عظیم خدمت ہو گی جس کی پہلے کوئی مثال نہیں ملتی، آیا اس مختصر رسالے میں مصنف علی عَلَیہِ السَّلام کو صحیح معنوں میں سمجھ سکا اور سمجھا سکا ہے اگر واقعا ایسا کر سکا ہے پھر تو زہے نصیب بڑی سعادت کی بات ہے ورنہ اس راہ میں ایک قدم اور اٹھایا جائے جائز توقع تو ہے کہ آخر کار جویندہ یابندہ کے مصداق کوشش جاری رہے گی، اور جستجو کرنے والے کو راستہ مل ہی جاتا ہے۔

سید رضا صدر۔ قم۔۱۹ ر مضان المبارک ۱۴۰۱ھ

کیا خوب سودا کیا علیؑ نے

علی عَلَیہِ السَّلام نے براہ راست خدا سے سودا کیا ہے جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِی نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللهِ وَاللهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ

یعنی "لوگوں میں ایسا بھی ہے جو اپنی جان کا سودا کر رہا ہے تا کہ خدا کی رضا اور خوشنودی کو حاصل کر سکے" (بقرہ۔۲۰۷)

مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ شب ہجرت حضرت علی عَلَیہِ السَّلام کی شان میں نازل ہوئی ہے جس رات حضرت علی عَلَیہِ السَّلام نے خود کو رسول پر فدا کر دیا تھا۔ علامہ مجلسی بحارالانوار جلد۳۶ صفحہ ۴۰ تا ۵۱ میں شیعہ سنی تفاسیر سے کئی روایات نقل کی ہیں۔

"یشری" کا لفظ واقعہ میں ہونے والے سودے کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور سودے کے چار ارکان ہوتے ہیں (۱) خریدنے والا (۲) بیچنے والا (۳) سودے کا سامان (۴) قیمت

چنانچہ اس معاملہ میں خریدار اللہ تعالیٰ ہے بیچنے والا علی عَلَیہِ السَّلام ہے سامان تجارت علی عَلَیہِ السَّلام کی جان ہے اور قیمت رضائے الٰہی و مرضی خالق ہے۔

اس اجمال کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ انسانی غریزے اور خواہشات کچھ چیزوں میں محصور ہیں مثلاً مال و دولت ، عیش و آرام، عزت و آبرو، اولاد

اور حیات، یعنی زندگی میں یہی پانچ چیزیں انسان کی بنیادی اور اصولی خواہشات ہیں اور دیگر خواہشات کا مرتبہ بعد میں آتا ہے کیونکہ باقی خواہشات ان پانچ تک رسائی اور ان کی حفاظت کا ذریعہ ہیں اور ان پانچ چیزوں کا بھی آپس میں بہت فرق ہے بایں معنیٰ کہ وہ ایک دوسرے کے متوازی نہیں ہیں اس لئے کہ ان میں سے جس چیز کی بھی قدر و قیمت دوسری سے کم ہو گی تو اسے اس پر قربان ہونا پڑے گا، پہلی چیز ہدف یا مقصود ہو گی اور دوسری اس کے لیے وسیلہ یا ذریعہ قرار پائے گی مثلاً مال و دولت وسیلہ ہے عیش و آرام کے لیے لہٰذا اسے اس پر قربان ہونا پڑتا ہے اور اولاد پر فدا ہونا پڑتا ہے اور ان کی زندگی کی بھینٹ چڑھنا پڑتا ہے کچھ لوگ ایسے ہیں جو دولت کو اپنا اصلی مقصد بناتے اور دولت کو دولت ہی کے لیے کماتے ہیں زندگی کو جینے کی خاطر حاصل کرتے ہیں اور جان کو جان ہی کے لیے عزیز سمجھتے ہیں

جان زیادہ عزیز ہے یا عزت؟

اب یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا جان زیادہ عزیز ہے یا عزت اور نیک نامی؟ یہاں پر اختلاف نظر پایا جاتا ہے کچھ لوگ پہلے نظریے کے حامی ہیں اور کچھ دوسرے کے اور جو چیز قطعی اور حتمی ہے وہ یہ کہ صاحبان عقل و شعور اپنے پاس جو کچھ بھی رکھتے ہیں اسے خود پر قربان کر دیتے ہیں اور انسان کے لیے

"خود" ہر شے سے زیادہ عزیز اور ارجمند ہے لیکن آیت کریمہ کچھ اور کہتی ہے وہ کہتی ہے کہ "خود" سے بالاتر ایک اور چیز بھی ہے جس پر "خود" کو بھی قربان کرنا پڑتا ہے اور وہ ہے "اصل مقصد یا ہدف" جس تک پہنچنے کے لیے انسانی جان "وسیلہ" یا ذریعہ ہوتی ہے اور یہ سطح فکری عام انسانوں کی سوچ سے بالاتر ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ بات آسانی سے سمجھی جاسکتی ہے کہ "ہیں کچھ لوگ ایسے جو اپنی جان کو ایک اعلیٰ اور ارفع مقصد تک پہنچنے کا وسیلہ اور ذریعہ سمجھتے ہیں اور وہ ہدف یا مقصد ہے رضائے الٰہی یا "خوشنودی حق" جو جان سے برتر اور بالاتر ہے"۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رضائے الٰہی کے حصول اور حق کی خوشنودی کی خاطر جان کا قربان کر دینا اگرچہ "لفظی" مفہوم کے نقطہ نظر سے دلچسپ اور صحیح ہے لیکن مصداق اور حقیقت کے لحاظ سے اس کا مفہوم واضح نہیں ہے اس لیے کہ جو جان رضائے الٰہی کے حصول اور خوشنودی حق کی خاطر فدا کی گئی ہو وہ "فدا" ہو چکی ہے اب یہ رضا اور خوشنودی کون حاصل کرے گا؟ کیونکہ گفتگو کے آغاز میں بتایا گیا ہے کہ سودے کے چار ارکان ہیں اگر ان میں سے کوئی ایک نہ ہو تو "سودا" نہیں رہتا اور وہ چار ارکان یہ ہیں (۱) بیچنے والا (۲) خریدنے والا (۳) مال تجارت) اور (۴) قیمت۔ جب اس سودے میں بیچنے والا فانی ہو جائے تو پھر قیمت کس کو ملے گی؟

باالفاظ دیگر مال تجارت یا سامان تجارت خود بیچنے والا ہے اور بیچنے والا خود مال تجارت یا سامان تجارت ہے چونکہ ان چار ارکان میں سے ایک مفقود ہے لہٰذا معاملہ صحیح نہیں ہو گا۔

اس مشکل کا حل

یہ ہے کہ انسانی زندگی یا حیات انسانی اس دنیوی زندگی میں محدود نہیں ہے بلکہ اس کے بالا سے بالاتر یا عظیم سے عظیم تر مراتب ہیں، کیونکہ ارباب منطق کے بقول حیات ایک ایسی حقیقت ہے جس کے کئی مراحل ہیں(۱)نباتاتی حیات(۲)حیوانی حیات جو اس سے بالاتر مرحلے پر ہے(۳)انسانی حیات جو پہلی دونوں حیات سے بالاتر مرحلے پر ہے اور پھر ان مراحل کے کئی درجے ہیں۔

انسانی حیات اس جلد گزر جانے والی زندگی میں محصور نہیں ہے اگر اسی میں محدود ہو تو پھر اس حیات میں اور حیوانی زندگی میں کوئی فرق نہیں رہے گا اس لیے کہ حیوانی زندگی کو حقیقی حیات یا حقیقی زندگی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ حقیقی زندگی وہی ہوتی ہے جو ہمیشہ کی زندگی ہو، نا کہ عارضی ہو کہ جو کبھی ہو اور کبھی نہ ہو، بلکہ حقیقی زندگی ابدی اور ہمیشہ کی زندگی ہوتی ہے جسے فنا نہیں ہوتی اور مذکورہ ہر قسم کی زندگی کوئی بھی ابدی نہیں ہے اس لیے کہ وہ فنا ہو جاتی ہیں اور "فنا" کو "حیات" نہیں کہا جا سکتا اور حیات اسے کہتے یں جو "بقا" کے ساتھ ملی

ہوئی ہو اور اگر اس میں بقا نہیں ہو گی تو "سلب الشئ عن نفسہ "(یعنی کسی شئ کا وجود اس سے سلب کر لیا جائے پھر بھی وہ چیز رہے) لازم آئے گا جو محال ہے۔

لہٰذا جو زندگی ہمیشہ کے لیے زندگی رہے وہ "ابدی" ہوتی ہے اور اس قسم کی زندگی کا وجود اس دنیا میں ممکن نہیں ہے اس لیے کہ یہ دنیا خود فانی ہے ابدی نہیں ہے لہٰذا یہ کسی ہمیشہ زندہ رہنے والے شخص کی جگہ نہیں ہو سکتی اس لیے کہ اس دنیا میں جسے ہم زندگی کہتے ہیں در حقیقت یہ ضرورتوں کا گھر ہے جس میں روٹی کپڑا اور مکان چاہیے اور اس قسم کی ہزاروں دوسری اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے جو اس میں رہنے والے زندہ کو نہ ملیں وہ "زندہ" نہیں رہے گا۔

جو لوگ "آب حیات" کی تلاش میں رہے ہیں اگر ان کا مقصد یہ "فانی حیات" ہے پھر تو انہوں نے خطا کی ہے لیکن اگر ان کا مقصد اس فانی دنیا کے بعد بھی "باقی" رہیں تو پھر ٹھیک کیا ہے۔

خلاصہ کلام

اس ساری گفتگو سے یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ حیات در حقیقت ابدی حیات ہے اور زندگی در حقیقت دائمی زندگی ہے یا یوں سمجھیں کہ فانی زندگی کو بیچ کر لافانی اور غیر محدود زندگی کو خرید لیا جائے یہ ہے در حقیقت عاقلانہ اور قابل قبول سودا۔ ضرورتوں والی زندگی کو دے کر بے نیاز زندگی حاصل کرنا ہی ایک بہترین سودا ہے۔

"مَن" کی زندگی کو خیر باد کہہ کر" اسی "-ذات پاک -سے جا ملنا حیات ابدی ہے۔اس دنیا کی زندگی میں آپ دیکھنے کے لیے آنکھ کے محتاج ہیں، سننے کے لیے کان کے محتاج ہیں، لیکن اُس حیات ابدی میں آپ بغیر آنکھوں کے دیکھیں گے اور بغیر کانوں کے سنیں گے،اس زندگی میں آپ دور کی چیزوں کو نہیں دیکھ سکتے، پسِ دیوار آپ کو کچھ نظر نہیں آتا جب کہ اُس زندگی میں دوراور نزدیک کے فاصلے ختم ہو جائیں گے، دیکھنے اور سننے کے لیے کوئی دیوار اور پردہ حائل نہیں ہو گا، خداوند عالم کی رضااور خوشنودی آبِ زندگی ہے آبِ بقاہے اور آبِ حیات ہے، حیات ابدی ہے، حیات جاودان ہے، حیات سرمدی ہے۔

حضرت علی عَلَیہِ السَّلام نہج البلاغہ میں متقین کے اوصاف میں فرماتے ہیں:

وَبَاعُوا قَلِيلًا مِنَ الدُّنْيَا لَا يَبْقَى بِكَثِيرٍ مِنَ الْآخِرَةِ لَا يَفْنَى (نہج البلاغہ صبحی صالح خطبہ ۱۸۲ص ۲۶۴)

"ان لوگوں نے اس دنیا کی ناچیز متاع کو فروخت کر کے آخرت میں اس کائنات کی کثیر لافانی جائیداد کو خرید لیا ہے" یعنی انہوں نے محدود زندگی کو فدا کر کے غیر محدود حیات جاودانی کو حاصل کر لیا ہے گویا انہوں نے اِس زندگی کو وسیلہ قرار دیا اور اُس زندگی کو مطلوب و مقصود سمجھا ہے اِسے مال و متاع بنایا اور اُسے اس کی قیمت سمجھا ہے۔

حضرت علی بن ابی طالب عَلَیہِ السَّلام کے خدا کے ساتھ بہت سارے سودے ہیں بلکہ آپؑ کی پوری زندگی ہی خدا کے ساتھ سودوں اور فداکاری سے عبارت

ہے۔ آپؑ کی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں جو نفس کے ساتھ جہاد اور خدا کے ساتھ سودے سے خالی ہو لیکن شب ہجرت آپؑ نے خدا سے جو سودا کیا ہے اسے ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے اس لیے کہ اس میں آپؑ کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ تاریخ بشریت میں اولیاء خدا سے مجھے کوئی ایسا ولی نظر نہیں آتا جس نے خدا کے ساتھ ایسا سودا کیا ہو!!

آیت مجیدہ میں لفظ "یشری" **فعل** مضارع کے ساتھ استعمال ہوا ہے "شریٰ" ماضی کے صیغے کے ساتھ مذکور نہیں ہوا اس کا فرق یہ ہے کہ مضارع میں جو استمرار، تسلسل اور جدیدیت پائی جاتی ہے وہ ماضی میں نہیں پائی جاتی جس کا مقصد یہ ہے کہ حضرت علی عَلَیْہِ السَّلَام ہر روز فداکاری، جان نثاری، جان سپاری اور خدا کے ساتھ سوداکاری کیا کرتے تھے اور شب ہجرت میں آپؑ کی فداکاری کا خصوصی امتیاز یہ ہے کہ اس دوران میں اسلام کے ظہور کا آغاز تھا اور وہ اس کا کمزور ترین دورانیہ تھا اور یہ وہ دور تھا کہ ابھی جہاد اور فداکاری کا حکم نہیں آیا تھا اور اس عرصے میں حضرت علی عَلَیْہِ السَّلَام نے فداکاری اور سرفروشی کے ایسے کارنامے کا آغاز کیا جو عالم بشریت کے لئے جان نثاری اور جان سپاری کا ایک اعلیٰ نمونہ قرار پایا۔

ساتھ ہی ایک خصوصی امتیاز اور بھی تھا کہ ابھی علی عَلَیْہِ السَّلَام کی جوانی کا آغاز تھا اور آپ نے ابھی تک زندگی کی صرف بیس بہاریں دیکھی تھیں، ابھی تک رشتہ ازدواج میں بھی منسلک نہیں ہوئے تھے آپ کی زندگی کا ابھی ایک

پھول بھی نہیں کھلا تھا اور خدا کے ساتھ آپ کا یہ سودا آپ کی زندگی کا پہلا شگفتہ پھول تھا جس نے اس کائنات کو اپنی خوشبو سے معطر کیا، اگر علی عَلَیہِ السَّلام کا یہ سودا نہ ہوتا تو شاید حضور پیغمبر اسلام صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَآلِہِ وَسَلَّم کو شہید کر دیا جاتا اور وہ اسلام کہ جو ابھی عالم بشریت کے سامنے صحیح معنوں میں پیش بھی نہ ہوا تھا اور یہ مقدس اجتماعی، معاشرتی، عالمی اور ابدی منشور نیست و نابود ہو جاتا۔

ہر قربانی اور فداکاری کی قدر و قیمت کا اندازہ اس کی تاثیر سے لگایا جاتا ہے، لہٰذا اس کے پیش نظر حضرت علی عَلَیہِ السَّلام کی فداکاری اور قربانی کی قدر و قیمت کوئی معمولی نہیں ہے بلکہ کئی جہان، کئی دورانیے اور کئی انسان اس کی قیمت ہیں۔

اس ایثار و فداکاری کا ایک اور نمایاں امتیاز یہ بھی ہے کہ آپ شب ہجرت بستر رسول صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَآلِہِ وَسَلَّم پر ایسی حالت میں سوئے تھے جبکہ بالکل نہتے تھے اور اپنے دفاع کا کوئی ذریعہ نہیں تھا جس سے دشمن پر حملہ آور ہو سکیں، بلکہ ایک یکا و تنہا مجاہد بستر پر سویا ہوا تھا جو اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتا تھا، بلکہ ہر حالت میں اسے اپنے پیکر مطہر کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے اور جسم اطہر کے پاش پاش ہونے کی توقع تھی۔

حضور پیغمبر اسلام صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَآلِہِ وَسَلَّم نے تیرہ سال مکہ میں رہ کر اسلام کی دعوت دی، قریش اور مکہ کے دوسرے لوگوں کو بت پرستی چھوڑ کر توحید پرستی کی دعوت دیتے رہے، مگر ان لوگوں نے نہ صرف آپ کی دعوت پر لبیک نہ کہی بلکہ

اس کے برعکس ایذا رسانی اور اذیت دینے پر کمر بستہ ہو گئے، اپنی طرف سے بے غیرتی اور بے شرمی کا مظاہرہ کیا اور آپ کی شان میں گستاخیاں بھی کرتے رہے۔

تین برس تک آپؐ کا اور آپؐ کے اعزاء و اقارب کا اقتصادی محاصرہ کئے رکھا انہیں فاقہ کشی پر مجبور کر دیا، تمام بنی ہاشم کے زن و مرد اور پیر و جوان پر آب و دانہ بند کر دیا، مسلمانوں کو اذیتوں اور سزاؤں کا نشانہ بناتے رہے، لیکن نہ تو آپؐ کے پائے استقلال میں کسی قسم کی لغزش پیدا ہوئی اور نہ ہی دعوت تبلیغ میں کوئی کمزوری پیدا ہوئی، آپؐ کے عزم و استقلال کو دیکھ کر تمام قریش کی نیندیں اڑ گئیں، انہوں نے آپؐ کے وجود سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی تدبیریں سوچنا شروع کر دیں اور اسی سلسلے میں انہوں نے ایک بہت بڑی مجلس شوریٰ تشکیل دی کہ بت پرستی کے اس دشمن سے کیونکر ہمیشہ کے لئے چھٹکارہ حاصل کیا جائے؟

سب سے پہلے آنحضرتؐ کے قتل کی تجویز پیش کی گئی، قریب تھا کہ اسے منظور کر لیا جائے کہ یہاں پر ایک بڑی مشکل یہ درپیش آگئی کہ "یہ کام کون انجام دے گا؟" کیونکہ جو بھی اسے انجام دے گا وہ خود مارا جائے گا اس لئے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سر فروش اور جانباز پیروکار اور خود بنی ہاشم اسے ایک گھڑی تک کے لیے زندہ نہیں چھوڑیں گے اسے بہت جلد کیفر کردار تک پہنچا دیں گے۔

دوسری تجویز یہ سامنے آئی کہ آپؐ کو قید کر لیا جائے تاکہ اس طرح سے آپؐ کو قید خانہ میں بند کر دیں گے کہ اس میں ہی آپؐ کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن اس تجویز کو بھی مسترد کر دیا گیا، کیونکہ آپ کے فداکار سر فروش

پیروکار انہیں کب قید میں دیکھنا گوارا کریں گے وہ تو ہر ممکن طریقے سے انہیں وہاں سے چھڑا کر لے جائیں گے۔

پھر تیسری تجویز یہ سامنے آئی کہ انہیں مکہ سے جلاوطن کر دیا جائے لیکن یہ تجویز تو اور بھی خطرناک تھی کیونکہ آپؐ کا عزم واستقلال، آپؐ کی شیریں بیانی، آپؐ کی بے مثال روحانی قوت میں ایسی طاقت ہے کہ آپؐ جہاں بھی جائیں گے آپؐ کی دعوت تبلیغ کامیابی سے ہمکنار ہو گی، زیادہ سے زیادہ لوگ آپؐ کے فریفتہ ہوں گے اور آپ کے پیروکاروں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا جائے گا، پھر اپنے ان پیروکاروں کے ساتھ مکہ واپس آکر بت پرستوں کا ایسا ستیاناس کر دیں گے کہ روئے زمیں پر ہم میں سے ایک بھی بت پرست نظر نہیں آئے گا۔

ایک مرتبہ پھر مجلس شوریٰ سر جوڑ کر بیٹھی کہ بت پرستی کے اس بڑے دشمن کو کیونکر راستے سے ہٹا دیا جائے؟ کوئی ایسا راستہ اختیار کیا جائے کہ کامیابی بھی مل جائے اور کسی قسم کے خطرے کا سامنا بھی نہ کرنا پڑے، آخر کار شوریٰ نے مل کر یہ فیصلہ کر لیا کہ قریش کے دس قبائل میں سے ایک ایک فرد کا انتخاب کیا جائے اور سب مل کر آپ پر اچانک حملہ کر کے آپ سے متاع زندگی چھین لیں، اس طرح سے نہ تو کسی قاتل کی شناخت ہو سکے گی اور نہ ہی دس قبائل کا مقابلہ بنی ہاشم کے لیے ممکن ہو گا، لہٰذا آپؐ کا خون رائیگاں جائے گا اور ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے کیونکہ قصاص یعنی خون کا بدلہ خون کی صورت

میں لینا ان کے لیے ناممکن ہو گا، البتہ سرمایہ دار کفارہ اور ثروت مند انِ قریش "خون بہا" ادا کر کے انہیں راضی کر لیں گے۔

اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانا بھی بظاہر آسان معلوم ہو تا تھا، وہ یوں کہ رات کو جب آپؐ اپنے بستر پر محو استراحت ہوں یہ دس نمبر کے لوگ آپؐ پر ٹوٹ پڑیں اور آپؐ کی زندگی کا چراغ گل کر دیں، کیونکہ آپؐ کے گھر کا دروازہ رات کو بند نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا اور عجیب اتفاق کی بات یہ ہے کہ ان دس نامزد قاتلوں میں سے ایک جناب پیغمبر اسلام ﷺ کے ایک چچا "ابو لہب" کا بیٹا بھی تھا جو حضور ﷺ کی تمام جزئیات زندگی سے واقف تھا۔

غرض قرارداد منظور کر لی گئی اور دس قاتلوں کا انتخاب بھی ہو گیا جن کا تعلق کفر کے سرداروں سے تھا یہ منصوبہ بڑی رازداری سے تیار کیا گیا تھا اور ارکان شوریٰ کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا، صرف "محمدؐ کے خدا" کے علاوہ باقی سب بے خبر تھے لہٰذا اس نے اپنے رسول کو اس سے آگاہ کیا اور مکہ سے ہجرت کر کے جانے کا حکم بھی صادر فرمادیا کیونکہ آنجناب کا مکہ میں رہنا اب ناممکن ہو گیا تھا اس لئے کہ کفار کا یہ فیصلہ ہمیشہ کے لیے قابل اجرا تھا، لہٰذا حضور ﷺ کی ہجرت کو مخفی رکھا گیا تاکہ دشمن کو اس کا علم نہ ہو سکے ورنہ وہ آپ کو جنگل اور بیابان میں بھی قتل کر سکتے تھے جس سے ان کا پلید مقصد آسانی کے ساتھ انہیں حاصل ہو جاتا۔

غرض موعودہ رات آگئی حضور گرامی ﷺ کا بستر بچھایا گیا اور اس پر "کوئی" سو بھی گیا۔ جن قریشیوں نے حضور ﷺ کے گھر کا محاصرہ کیا ہوا تھا وہ سمجھے کہ سونے والا "محمدؐ" ہے، انہوں نے تھوڑا صبر کیا کہ رات اچھی طرح تاریک ہو جائے اور سب لوگ سو جائیں تاکہ یہ دس لوگ نہ پہچانے جا سکیں اور بڑی خاموشی کے ساتھ اس جرم کا ارتکاب کیا جائے تاکہ آپ کا قتل ہمیشہ کے ایک راز رہے۔

جب حملے کا آغاز ہوا اور انسانیت کے قاتل، پیغمبر ﷺ کے بستر کی طرف بڑھے تو اس پر علی علیہ السلام کو محو آرام پایا تو ان سے پوچھا کہ "محمد کہاں ہیں" جواب ملا کہ وہ مکہ سے باہر چلے گئے ہیں، انہوں نے پوچھا کہ کہاں گئے ہیں؟ فرمایا وہ جانیں اور ان کا راستہ! چونکہ تم لوگ ان کے مکہ میں رہنے کو برداشت نہیں کرتے تھے لہٰذا وہ ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلے گئے ہیں۔

ان لوگوں نے سوچا کہ علی علیہ السلام کو قتل کر دیا جائے لیکن یہ رائے مسترد کر دی گئی کیونکہ محمدؐ پھر بھی زندہ رہیں گے جن سے ہمیں خطرہ ہے علی علیہ السلام کو قتل کر کے ہمیں کیا ملے گا؟ لہٰذا وہ ناکام واپس چلے گئے۔

علی علیہ السلام پیغمبر خدا ﷺ کے بستر پر سو گئے تاکہ محمد مصطفیٰ ﷺ زندہ رہیں علی علیہ السلام نے اپنے آپ کو محمد ﷺ پر قربان کر کے خدا کے ساتھ سودا کر لیا۔ تاکہ اس کا بھیجا ہوا رسول زندہ رہے، تاکہ عالم بشریت اللہ کی اس عظیم رحمت سے بہرہ مند ہوتا رہے، تاکہ انسانیت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سعادت مند اور

خوش بختی سے فیض یاب ہوتی رہے، تاکہ اس دنیا سے ظلم و جور کا خاتمہ ہو جائے۔

علی علیہ السلام کے سودے کوئی ایک دو نہیں ہیں بلکہ آپؑ کی پوری زندگی کا خدا کے ساتھ سودا ہو چکا ہے۔ تاریخ عالم غزوہ احد میں علی علیہ السلام کی جانبازی اور فداکاری کی مثال پیش نہیں کر سکتی، کیونکہ اس جنگ میں آپؑ نے اپنے پورے مقدس پیکر کو رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ڈھال بنا دیا تھا اور مردانہ وار آپؐ کی حفاظت فرمائی اور پوری کوشش کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دشمن کی طرف سے کوئی آنچ نہ آنے پائے۔

یہ جنگ کوہ احد کے کنارے ایک میدان میں واقع ہوئی تھی اور کوہ احد ایک لمبی اور طولانی دیوار کی مانند اس میدان کے گرداگرد تھا اور اس کے درمیان ایک درہ ہے جو اسے دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے اور لوگوں کی وہاں سے آمدورفت کا ذریعہ ہے اور اس وقت یہ درہ لشکر اسلام کے بالکل پیچھے تھا اور لشکر کفر کی طرف سے کمین گاہ کا کام دے کر اس کی پشت پر خنجر مارنے کا ذریعہ بن سکتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس خطرے کی پہلے سے پیش گوئی کر دی تھی اس لیے پچاس تیر اندازوں کو اس کی حفاظت پر مقرر فرما دیا تھا اور حکم دیا کہ کفر کی طرف سے اس راستے سے حملے کو روکیں اور کسی بھی صورت میں اس جگہ کو ہرگز نہ چھوڑیں چاہے ہمیں فتح ہو جائے یا شکست۔

چنانچہ اگر آپؐ کے اس فوجی حکم پر عمل درآمد کیا جاتا تو لشکر اسلام کو پشت کی طرف سے حملے کا خطرہ ہمیشہ کے لیے ٹل جاتا لیکن شومئ قسمت کہ آپؐ کے اس حکم کی تعمیل نہیں کی گئی اور فوجیوں نے یا تو آپؐ کے فرمان پر کان نہیں دھرا یا پھر اپنی طرف سے اس کی تفسیر و تاویل کی۔

بہرکیف جنگ شروع ہوئی اور علی ابن ابی طالب عَلَیہِ السَّلام کی بے مثال بہادری اور دلاوری کی وجہ سے مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی کفر کے لشکر کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا، اب مسلمانوں کی فاتح فوج نے دشمن کی شکست خوردہ فوج کے مال غنیمت پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا اور سپاہ کفر کے احتمالی حملے سے غافل ہو گئے حالانکہ اس حملے کا امکان سو فیصد تھا، اس شکست میں سپاہ کفر کا جانی نقصان بہت ہی مختصر ہوا، ان کے صرف چند ایک سردار مارے گئے تھے۔

لشکر کفر کا میدان جنگ سے فرار اور لشکر اسلام کا ان کا تعاقب نہ کرنا اس بات کا باعث بن گیا کہ انہوں نے اپنی شکست کی ذلت کو فراموش کر کے از سر نو اپنے حوصلوں کو بلند کیا اور اپنے شکست خوردہ فوجیوں کو مسلمانوں کی آنکھوں سے دور دوبارہ منظم کیا اور اسلحہ لے کر کوہ احد کا چکر لگایا اور اسی درے کو مجاہدین سے خالی پا کر لشکر اسلام پر حملہ کر دیا، درے کے محافظوں کی کوتاہی نے کفار کے منصوبے کی کامیابی میں مدد کی، اگرچہ اس دستے کا کمانڈر انہیں غنیمت کی لوٹ مار میں شرکت کرنے سے روکتا رہا اور انہیں پکار پکار کر کہتا رہا کہ اپنے مورچوں کو خالی نہ چھوڑو، پیغمبر خدا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَآلِہِ وَسَلَّم کے فرمان کی اطاعت پر قائم رہو لیکن

اس کی ان باتوں کا ان پر کوئی اثر نہ ہو اور کہنے لگے ، اب جنگ ختم ہو گئی ہے اور حضور پاک ﷺ کا فرمان بھی دوران جنگ سے مخصوص تھا، یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ کو چھوڑ کر غنیمت لوٹنے میں دوسرے مجاہدین کے ساتھ شریک ہو گئے اور تمام پچاس افراد میں سے صرف ایک جانباز کمانڈر اور چھ دوسرے سپاہی اپنی جگہ پر باقی رہ گئے تھے اور دشمن کے حملے سے وہ سب شہید ہو گئے۔

اسلام کے ان سپاہیوں کی غفلت نے کفار کے لشکر کو حملے کے لئے مدد فراہم کی اور انہیں مسلمان فوج پر غالب آنے کے اسباب فراہم کئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لشکر اسلام کی ایک بہت بڑی تعداد نے جام شہادت نوش کیا، جو بچ گئے انہوں نے راہ فرار اختیار کرنے میں اپنی عافیت جانی اور اسلام کے اس عظیم الشان پیغمبر ﷺ کو زخمی حالت میں دشمن کے نرغے میں چھوڑ کر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گئے اور لشکر کفار نے چاروں طرف سے آپؐ پر حملے کرنا شروع کر دیئے۔

ان خطرناک اور حساس لمحات میں حضرت علی ابن ابی طالب عَلَیْہِ السَّلَام نے خود کو حضور پاک ﷺ کی خدمت میں پہنچا دیا اور یہ وہ موقع تھا کہ جب کفار حضور پاکؐ کی ذات کے بہت قریب پہنچ چکے تھے اور قریب تھا کہ آپؐ سے کسی قسم کا کوئی انتقام لیں، حیدر کرار اس وقت شمع کے گرد پروانے کی حیثیت اختیار کر گئے اور حضور سرور کائنات ﷺ کے گرداگرد گھوم کر انہیں دشمن کے ہر وار سے بچاتے رہے، اور جہاں سے بھی حضور ﷺ پر حملہ ہوتا علی عَلَیْہِ السَّلَام ادھر کا رخ

کر کے اسے ناکام بنا دیتے، دشمن اس قدر حضورؐ کے نزدیک ہو چکا تھا کہ صرف چند قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا، لیکن علی عَلَیہِ السَّلام بڑھ بڑھ کر اس پر حملے کر رہے تھے، اس موقع پر آپؑ نے پیغمبر اسلام صَلّی اللہ عَلَیہِ وَآلِہ وَسَلَّم کے لیے اپنی جانبازی اور جانثاری کا حق ادا کر دیا، جبکہ دشمن کی طرف سے آپ کے پیکر پاک پر تیروں، تلواروں اور نیزوں کے بے شمار زخم آئے مگر آپؑ نے اس کی قطعا کوئی پروا نہیں کی آپؑ کا ہدف صرف پیغمبر صَلّی اللہ عَلَیہِ وَآلِہ وَسَلَّم کی جان کی حفاظت تھا،ان بے شمار زخموں میں سے اسی (۸۰) گہرے زخم آپ کو لگے تھے۔

اس قدر شدید زخموں کی وجہ سے اگرچہ آپ کی طاقت جواب دے گئی لیکن آپ اپنے خون کے آخری قطرے تک کو قربان کر دینے پر تلے ہوئے تھے، تاکہ اس طرح حضور صَلّی اللہ عَلَیہِ وَآلِہ وَسَلَّم کی جان سلامت رہے۔

جب پاؤں کی طاقت جواب دے گئی تو آپؑ نے گھٹنوں کے ذریعہ کئی بار آپؐ کو زمین سے اٹھانا چاہا، آخر کار ایک مرتبہ آپؐ کو اٹھالیا اور پھر لڑنے میں مصروف ہو گئے، اتنا لڑے اتنا لڑے کہ آپ عَلَیہِ السَّلام کی تلوار ٹوٹ گئی، لیکن آپؑ نے نئی تلوار کے ساتھ جنگ کو جاری رکھا،اس معرکہ گیر ودار میں آخر کار آپؑ نے حضور سرور کائنات صَلّی اللہ عَلَیہِ وَآلِہ وَسَلَّم کو کینہ ور دشمن کے حملوں کے خطرے سے نجات دلا دی اور جب جنگ ختم ہوئی تو آپؑ سر تا پا خوں میں غلطاں اور زخموں سے چور ہو کر بستر پر لیٹ گئے، حضور پیغمبر اسلام صَلّی اللہ عَلَیہِ وَآلِہ وَسَلَّم آپؑ کی عیادت کے لیے تشریف لائے اور آپؑ کو دیکھتے ہی فرمایا کہ "جو شخص راہ خدا میں اس قدر فدا کاری

کرے اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کے لیے بہت بڑا اجر ہے، یہ سن کر حضرت علی عَلَیہِ السَّلام نے اپنی طرف سے خوشی کا اظہار فرمایا لیکن اپنے دکھ کا اظہار نہیں کیا، آپؑ کو خوشی اس بات کی تھی کہ میدان جنگ سے راہ فرار اختیار نہیں کی لیکن دکھ اس بات کا تھا کہ شہادت کا شرف حاصل نہیں کر پائے۔ حضور سرور کائناتؐ نے فرمایا یا علی عَلَیہِ السَّلام تمہیں آئندہ شہادت کا شرف بھی حاصل ہو گا،

دوسرے دن حضرت علی عَلَیہِ السَّلام اس مجروح اور خون آلود بدن کے ساتھ بستر سے اٹھے اور گھوڑے پر سوار ہو کر کفر کے نئے احتمالی حملے کو روکنے کے لیے غزوہ حمراء الاسد کے لیے روانہ ہو گئے، اور ایثار و فداکاری اور خدا کے ساتھ سودے کا استقبال کیا۔

(جنگ احد میں حضرت امیر المومنین عَلَیہِ السَّلام کے شجاعانہ کارناموں سے مطلع ہونے کے لیے شیخ مفید کی کتاب "الارشاد جلد ا ص ۸۷ تا ۹۲ کا مطالعہ فرمائیں)

حضرت علی عَلَیہِ السَّلام کی شجاعانہ زندگی میں جو نکتہ قابل توجہ ہے وہ یہ کہ آپ کی شجاعت کا طرہ امتیاز ہے جس نے آپ کو دنیا کے تمام بہادروں اور سورماؤں پر فوقیت حاصل ہے اسی لیے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا کہ علی ابن ابی طالب اشجع العرب نہیں بلکہ "اشجع عالم" تھے اور یہ امتیاز صرف آپ ہی کو حاصل ہے اور بس، جس کی نظیر ڈھونڈے نہیں ملتی۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ آپ نے کسی بھی جنگ میں کبھی پہل نہیں کی یعنی آپ نے کبھی جارحانہ انداز نہیں اپنایا کہ کسی میدان میں اترنے والے

آپ پہلے شخص ہوں اور دشمن کو للکارا ہو اور مبارز طلبی کی ہو بلکہ آپ کا ہر میدان میں اترنے کا انداز مدافعانہ ہوتا تھا، اسی لیے میدان میں اترنے والے دوسرے فرد ہوتے تھے اور آپ دفاعی جنگ لڑا کرتے تھے، جنگ بدر، احد، خندق اور خیبر میں پہلے کفار کے جنگجو میدان میں آتے تھے اور لشکر اسلام سے مبارز طلبی کرتے تھے تو آپ ان کو جواب دینے کے لیے میدان میں قدم رکھتے تھے۔

جنگ بدر میں پہلے سپاہ کفر سے عتبہ اور ولید میدان میں آئے میدان احد میں طلحہ ابن ابی طلحہ، خندق میں عمرو ابن عبد ود اور خیبر میں مرحب پہلے میدان میں آئے، پھر امیر المومنین علیہ السلام میدان میں گئے اور دفاع کیا، غرض عہد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جو بھی جنگیں لڑی گئیں اسی طرز پر لڑی گئیں، اور جمل، صفین اور نہروان کی جنگیں بھی اسی انداز میں تھیں، یعنی علی کے اس قدر شجاعت، دلاوری، جسمانی اور روحانی قوت رکھنے کے باوجود ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آپؑ نے میدان میں آکر دشمن کو للکارا ہو؟ اور یہ وہ صفت ہے تاریخ اسلام میں یاد نیا کے نامور بہادروں اور جنگ آوروں میں سے کسی میں نہیں پائی جاتی تھی، اور یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ علی علیہ السلام نہ جنگ جو تھے اور نہ کسی کو قتل کرنے کے خواہشمند تھے بلکہ وہ سب سے پہلے انسان تھے مہر و محبت کا پیکر تھے، رحمت کا سرچشمہ تھے، بعد میں مرد کارزار تھے اور ان کی ہر جنگ "دفاعی" ہوا کرتی تھی اور اسی کا نام "بزرگی" ہے "بزرگواری" ہے "شرف" ہے "فضیلت" ہے۔

عدل علی عَلَیہِ السَّلام

مولا علی عَلَیہِ السَّلام فرماتے ہیں کہ

كُنْتُ أَحْسَبُ أَنَ الْأُمَرَاءَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ فَإِذَا النَّاسُ يَظْلِمُونَ الْأُمَرَاءَ

"میں سمجھتا تھا کہ حکمران رعیت پر ظلم کرتے ہیں اب میں دیکھ رہا ہوں کہ رعیت حکام پر ظلم کر رہی ہے" (ابن شہر آشوب، مناقب آل ابی طالب جلد ۲ ص ۱۴۲)

آپ کے اس فرمان میں ایک اہم نکتہ ہے جس کی وضاحت ضروری ہے۔ اور وہ یہ کہ اس دنیا میں جو حکومتیں فرمانروائی کرتی رہیں یا کر رہی ہیں وہ مجموعی طور پر تین طرح کی ہیں ۱۔ فرد واحد کی استبدادی حکومت ۲۔ اقلیت کی حکومت ۳۔ اکثریت کی حکومت۔

۱۔ شخصی یا فرد واحد کی حکومت

شخصی یا فرد واحد کی استبدادی حکومت نے تاریخ کے ایک لمبے عرصے تک دنیا کی زمام امور کو اپنے ہاتھوں میں لیے رکھا، اور اس دور میں بھی کئی ملکوں میں یہی طرز حکومت قائم ہے فرد واحد کی حکومت سے مراد یہ ہے کہ تمام لوگوں پر صرف ایک ہی شخص حکمرانی کرتا ہے، وہ ان کے تمام سیاہ و سفید کا مالک ہوتا ہے اس کی حکومت کو قانون کی حکومت یا مذہبی حکومت کا نام دیا جاتا ہے۔ جس شخص کے ہاتھ میں تمام لوگوں کی زمام امور ہوتی ہے وہ آمر مطلق یا ڈکٹیٹر

ہوتا ہے خواہ وہ "بادشاہ" کہلائے یا "امیر"، "خان" کہلائے یا "شیخ قبیلہ" یا کوئی اور نام اپنے لیے اختیار کر لے۔

اگر ایسے شخص کی حکومت مذہبی ہو تو وہ "خلیفہ" کہلاتا ہے یا اپنے لیے کوئی لقب اختیار کر لیتا ہے۔ اور اگر قانون کے نام سے ہو تو پھر اس کا عنوان کوئی اور ہوتا ہے، صورت حال خواہ کچھ بھی ہو لیکن اس بارے میں جو بات مسلم ہے وہ یہ کہ ان حکومتوں کی بنیاد زبردستی، طاقت، دھونس اور دھاندلی پر رکھی جاتی ہے اور "حکمران کی لاٹھی ہوتی ہے اور اسی کی بھینس" ایسی حکومتوں میں حکمرانِ اعلیٰ کا جبر و استبداد اس کے تمام ماتحت حکام تک میں سرایت کر جاتا ہے اور ان میں سے ہر ایک حاکم اپنے زیر اثر علاقہ میں آمر مطلق یا ڈکٹیٹر ہوتا ہے۔ اس قسم کی حکومت میں نہ صرف رعایا ظلم کی چکی میں پستی ہے چھوٹے ظالم اپنے سے بڑے ظالم کے ظلم سے بھی محفوظ نہیں ہوتے۔

۲۔ اقلیت کی حکومت

چند افراد پر مشتمل ایک گروہ کی حکومت کو کہتے ہیں جو ایک پارٹی کے نام سے چلائی جاتی ہے اس قسم کی حکومت کا دنیا میں وجود نہیں ملتا، ابھی اسی آخری صدی میں اس کا سراغ ملتا ہے اس طرز کی حکومت بھی ظلم و ستم کے ساتھ قائم ہوتی ہے استبداد اور ڈکٹیٹر شپ ظلم ہے خواہ فرد واحد کی حکومت کی

صورت میں ہو خواہ کسی مختصر سے گروہ کی حکومت کی صورت میں، ذاتی خواہشات کی تکمیل کے لیے اگر کوئی حد مقرر نہ ہو تو پھر دوسروں کے حقوق کو پامال کرنا پڑتا ہے وہ آزادی جو صرف چند انگشت شمار لوگوں کے ساتھ مخصوص ہو وہ یقیناً دوسرے لوگوں کی آزادی کے لیے ضرر رساں ہوتی ہے اور ان سے آزادی سلب کر لیتی ہے۔

اس حکومت کی بنیاد بھی فرد واحد کی استبدادی حکومت کی بنیاد کی مانند "طاقت" پر استوار ہوتی ہے نا کہ "عوام" پر۔ لہٰذا اس حکومت میں جو بھی "طاقت" کا مخالف ہوتا ہے اسے صفحہ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ اظہار آزادی پر پہرے لگا دیئے جاتے ہیں۔ لکھنے والے قلموں کو توڑ دیا جاتا ہے، ہیئت حاکمہ پر کسی کو تنقید کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ بصورت دیگر اسے کیفر کردار تک پہنچا دیا جاتا ہے، جیلوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے، رسوا کیا جاتا ہے، گالیاں سننا پڑتی ہیں اور تہمتوں کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔

۳۔ اکثریت کی حکومت

تیسری قسم کی حکومت جو اکثریت کی حکومت کہلاتی ہے ،پہلی دو قسموں سے بالکل مختلف ہوتی ہے ابراہام لنکن نے اس حکومت کی یوں تعریف کی ہے "عوام کی حکومت عوام کے لیے اور عوام کے اوپر" اس قسم کی حکومت

کو" قومی حکومت "کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ حکومت کی باگ ڈور اکثریت کے ہاتھوں میں ہوتی ہے اور اس دور میں اسے "ڈیموکریسی" یا جمہوریت کا نام دیا جاتا ہے، اس حکومت کو پہلی دو حکومتوں پر برتری حاصل ہے کیونکہ اس میں کسی حد تک لوگوں کو آزادی حاصل ہوتی ہے زبان اور قلم آزاد ہوتے ہیں، حکومت مخالف اخبارات شائع ہوتے ہیں ان پر پابندی نہیں لگائی جاتی ،ضبط نہیں کئے جاتے اس لئے کہ اس حکومت کا دارومدار عوام کے دوش پر ہوتا ہے، حکام وقت اپنی ذاتی خواہشات کی سو فیصد تکمیل نہیں کر سکتے، اس کے باوجود یہ حکومت بھی کمزور پر طاقتور کے ظلم سے خالی نہیں ہوتی، چونکہ اکثریت ہمیشہ اقلیتوں کے حقوق کو پامال کرتی رہتی ہے، لہٰذا" عوام کی حکومت عوام کے اوپر" نہیں کہلا سکتی، البتہ "اکثریت کی حکومت اقلیت پر" کہلا سکتی ہے اس حکومت میں حزب اختلاف کے اختلاف رائے کو ملک دشمنی کا نام دے کر ملک میں لا اینڈ آرڈر یا امن عامہ میں خلل ڈالنے ، قوم و ملت کے خلاف کام کرنے کا الزام لگا کر مقدمات چلائے جاتے ہیں قوم اور ملک کا غدار قرار دے کر سزائیں دی جاتی ہیں۔

غرض تینوں قسم کے طرز حکومت میں ہیئت حاکمہ ظلم سے خالی نہیں ہے بنابر ایں کیا خوب فرمایا آپ عَلَيهِ السَّلَام نے کہ "میں سمجھتا تھا کہ حکمران رعیت پر ظلم کرتے ہیں۔۔۔"

حضرت علی عَلَيهِ السَّلَام کی حکومت مذکورہ تینوں حکومتوں سے مختلف تھی نہ تو استبدادی اور آمرانہ تھی نہ اقلیتی او ایک پارٹی کی حکومت تھی اور نہ ہی

"اکثریت کی جمہوری حکومت" تھی، آپ کی حکومت میں حاکم کی طرف سے رعیت پر ظلم نہیں ہوتا تھا، کیونکہ عدل کی حکومت تھی اور عدل بھی عدل الٰہی تھا، اس حکومت میں اس کے اراکین رعیت کے خادم تھے نا کہ حاکم، یہ حکومت خدا کے لئے تھی نا کہ لوگوں کے لئے، اسی لیے اس میں نہ تو ریاکاری اور عوام فریبی تھی اور نہ ہی فقط نعروں پر مبنی تھی۔

اس طرح کا طرز حکومت ظلم و جور سے دور ہوتا ہے دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ نہیں ڈالا جا سکتا، نہ ہی اس میں دھونس اور دھاندلی ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رعیت اپنے حاکم سے نہیں ڈرتی، اور اس طرح کا حاکم ظالم کی بجائے مظلوم ہوتا ہے اسی بنا پر کیا خوب فرمایا مولائے کائنات نے کہ "اب میں دیکھ رہا ہوں کہ رعیت حکمرانوں پر ظلم کر رہی ہے"

دور حاضر میں فرشتہ عدالت کو عادلانہ فیصلوں کے لئے ایک علامت قرار دیا گیا ہے جس کے ایک ہاتھ میں ترازو اور دوسرے میں تلوار دی گئی ہے، ترازو عام لوگوں کے لئے مساوات کی علامت ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ قانون سب کے لئے برابر ہے اور تلوار اس بات کی علامت ہے کہ قانون کا مکمل اجراء کیا جائے گا اور جو قانون کو نہیں مانیں گے انہیں تلوار سے سیدھا کیا جائے گا، چونکہ قانون خشک ہے لہٰذا اس کا اجراء بھی خشک ہونا چاہیے، اس میں کسی قسم کی رو رعایت اور رحم و مہربانی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔

جہاں تک قانون سب کے لئے برابر والی بات ہے وہ درست ہے کہ وہ سب کے لئے ایک ہونا چاہیے لیکن قانون کا اجراء سختی اور سنگدلی سے ہونا چاہیے یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ سختی اور سنگدلی عدل کے خلاف ہے اس سے عدم عدل حاصل ہوتا ہے اور یہ "علامت "عدل علی عَلَیہِ السَّلام سے مطابقت نہیں رکھتی، کیونکہ عدل علی عَلَیہِ السَّلام کا اجراء مہر و محبت سے ہوتا ہے جبر و قہر سے نہیں۔

لہٰذا اگر ہم چاہتے ہیں کہ عدل علی عَلَیہِ السَّلام کو فرشتہ عدالت کے ذریعہ ظاہر کریں تو ہمیں چاہیے کہ اس کے ہاتھ میں تلوار کی بجائے شاخ زیتون قرار دیں جو مہر و محبت اور صلح و صفائی کی علامت ہے یعنی دنیا کو یہ بتائیں کہ عدالت کو محبت کے ذریعہ نافذ کیا جاسکتا ہے جبر و قہر سے نہیں، کیونکہ عدالت انسانیت کے ساتھ پیار و محبت کے علاوہ اور کچھ نہیں، ظالم کے ساتھ بھی مہربانی اور مظلوم کے ساتھ بھی مہربانی، ظالم کو ظلم سے روک کر اس سے مہربانی ہوگی اور مظلوم کو ظالم کے ظلم سے نجات دلا کر اس سے محبت ہوگی، اور عدل اسی کا نام ہی تو ہے۔

حکومت عدل میں خود عوام ہی قانون کا نفاذ کرتے ہیں ، عوام اور حکومت میں دوگانگی نہیں ہوتی، عوام حکومت بن جاتے ہیں اور حکومت عوام بن جاتی ہے، اور عوام پر عوام کی حکومت کا حقیقی مصداق عمل میں آجاتا ہے۔

یہاں پر عدل علی عَلَیہِ السَّلام کی حکومت کے چند نمونے پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں جو آپ کی حکومت کے شاہکار کہلانے کے مستحق ہیں اور نہج البلاغہ میں موجود ہیں۔

مثلا حضرت امیر عَلَیہِ السَّلَام نے اپنے ایک ملازم کو زکوٰۃ کی مقدار کے تعین اور وصول کرنے کے لیے بھیجا تو اسے ہدایات دیں: جاؤ! خداوند وحدہ لاشریک کے تقویٰ کے ساتھ ،،اور کسی مسلمان کو ہراساں نہ کرو اور نہ اسے ناراض کرو، اور نہ اس سے خدا کے حق سے زائد وصول کرو، چنانچہ جب تم اپنی ماموریت کے علاقہ میں پہنچو تو پانی کے کنارے جا کر پڑاؤ کرو، کسی کے گھر نہیں جاؤ اس کے بعد بڑے سکون اور وقار کے ساتھ لوگوں کے پاس جاؤ ،پہلے ان پر سلام کرو، ادب و احترام بجالانے کے بعد ان سے کہو "اے خدا کے بندو! مجھے ولی خدا (امام وقت اور خلیفہ) نے تمہارے پاس بھیجا ہے تاکہ میں تم لوگوں سے خدا کا وہ حصہ حاصل کروں جو تمہارے مال میں بنتا ہے، آیا تمہارے مال میں خدا کا کوئی حق بنتا ہے؟ اگر بنتا ہے تو اسے ولی خدا کو ادا کرو اگر کوئی شخص منفی جواب دے تو اسے رہنے دو اور اس کے ساتھ کسی قسم کا بحث مباحثہ نہ کرو اور جو شخص مثبت جواب دے تو اس کے ساتھ چل پڑو اور اسے ڈرائے دھمکائے بغیر وہ جو کچھ سونا چاندی تمہیں دے وہ لے لو، اور اگر کسی کے مال مویشی اور چوپائے ہوں تو ان کے مالک کی اجازت کے بغیر ان کے اندر مت داخل ہو، کیونکہ ان جانوروں کی زیادہ تعداد مالک کے متعلق ہے۔

جب تم ان جانوروں کے اندر داخل ہو جاؤ تو تمہیں اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ کہیں رعونت اور سختی سے ہرگز کام نہ لینا، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے رویہ سے کوئی جانور بدک جائے اور مالک کو کوئی تکلیف ہو۔

اب تم جانوروں کے گلے یا ریوڑ کو دو حصوں میں تقسیم کر دینا اور مالک کو یہ اختیار دو کہ ان میں سے کس حصے کو اپنے لیے حاصل کرتا ہے اور جو حصہ تمہارے پاس ہے اس کے پھر دو حصے کرو اس بار بھی مالک سے کہو کہ جو حصہ وہ اپنے لیے چن لے وہ اسے دے دو، اسی طرح تقسیم کرتے کرتے جب خدا کے حق تک پہنچ جاؤ تو وہ لے لو، لیکن اگر مالک اس طرح کی تقسیم سے پشیمان ہو جائے اور از سر نو تقسیم کا تقاضا کرے تو اس کی بات مان لو، اور دوبارہ اسے تقسیم کرو، یہاں تک کہ خدا کے حق تک پہنچ جاؤ، اور اسے لے لو۔ (نہج البلاغہ مکتوب ۲۵ ص ۳۸۱، ۳۸۰)

آیا آپ بتا سکتے ہیں کہ دنیا کی جمہوری حکومتوں میں مالیات کی وصولی کے لئے حکومتی کارندے اس طرح کا قانون اپناتے ہیں؟

عدل اور ظلم دو ایسے الفاظ ہیں جن کے مفہوم میں بھی تضاد ہے اور مصداق میں بھی۔

ظلم کے معنٰی ہیں کسی کے ساتھ زیادتی کرنا خواہ وہ مال میں ہو یا حق میں، خواہ آزادی میں ہو یا آرام و آسائش میں، خواہ جاہ و مقام میں ہو یا عہدے اور منصب میں، اور **عدل** اس قسم کی زیادتی کے ارتکاب سے دور رہنے کا نام ہے اور یہ بھی اس وقت ہو جب زیادتی پر قدرت ہو اور نہ کرے۔

ظلم ایک خارجی فعل ہے، اور عدل نفسانی فعل ہے، جو خارج کے افعال کے اسباب کے سلسلے میں موجود ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص خواہ

ظالم ہو یا عادل دونوں صورتوں میں ان کا قدرت مند ہونا ضروری ہے کیونکہ قدرت کے بغیر نہ تو ظلم کا حصول ممکن ہے نہ ہی عدل کا، لیکن ظلم پر قدرت رکھنے اور عدل پر قدرت رکھنے کے درمیان کوسوں کا فاصلہ ہے وہ یوں کہ ظالم کو دوسروں پر قدرت حاصل ہوتی ہے لیکن عادل کو دوسروں پر بھی قدرت حاصل ہوتی ہے اور اپنی ذات پر بھی، باالفاظ دیگر عادل کے اندر دو طرح کی قدرت ہوتی ہے اور ظالم میں صرف ایک قدرت ہوتی ہے ،عادل کو قدرت پر بھی قدرت حاصل ہوتی ہے جبکہ ظالم اس سے محروم ہوتا ہے یعنی عادل میں ظلم کی قدرت ہوتی ہے لیکن وہ نہیں کرتا جبکہ ظالم اس چیز سے محروم ہے۔

عدل خواہشات نفسانی پر قابو رکھنے کا نام ہے اور ظلم ان خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کا نام ہے ،عادل اپنے دل پر حکم چلاتا ہے، ظالم دل کا فرمانبردار ہوتا ہے ، ظالم دل کا اسیر ہوتا ہے اور عادل دل پر امیر ہوتا ہے ،عدل کے لئے ارادہ کی ضرورت ہے اسے روحانی طاقت چاہیے ہوتی ہے ظلم ہر شخص انجام دے سکتا ہے ، ظالم بچے بھی زیادہ ہیں اور مظلوم بچے بھی زیادہ ہیں ، ظلم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ، ظلم پر قدرت ہوتی ہے نا کہ مظلوم پر،جو شخص سرکشی اور لوگوں کے حقوق غصب کرنے پر قدرت رکھتا ہے وہ ظلم بھی کر سکتا ہے اس بارے میں خواہ مظلوم کو اس کا علم ہو یا اس سے غافل ہو،خواہ حاضر ہو یا غائب،خواہ وہ ظالم کی قدرت سے آگے ہو یا اس سے پیچھے ہو، ظالم کے ظلم میں مظلوم کا موجود ہونا بھی شرط نہیں ہے ، کس قدر گزشتہ لوگ ایسے ہیں جنہوں

نے مستقبل میں آنے والے لوگوں پر ظلم روا رکھا اور ان کا حق برباد کیا، جس طرح ظلم میں مظلوم کا وجود شرط نہیں اسی طرح اس کا حاضر ہونا بھی شرط نہیں، آپ کسی کی غیر موجودگی میں اس پر ظلم کر سکتے ہیں، کیونکہ ظلم کا دائرہ بہت وسیع ہے، اس میں ہر شخص داخل ہو سکتا ہے، کمزور طاقتور پر، اسیر امیر پر، مظلوم مظلوم پر ظلم کر سکتا ہے خواہ اس میں اس کی قدرت ہو یا قدرت نہ ہو، خواہ حاضر ہو یا غیر حاضر، خواہ موجود ہو یا غیر موجود، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، خواہ آگاہ ہو یا بے خبر، قصہ مختصر ظلم بے انتہا ہے اور عدل بہت کم۔

ہر شخص میں ظلم کی قدرت موجود ہے لیکن اس قدرت کو قابو میں رکھنے والے بہت کم ہیں، عدل ایک گوہر نایاب ہے کیونکہ اسے اس قدرت پر بھی قدرت حاصل ہے۔

بدترین ظلم وہ ہوتا ہے جو عدل کے نام پر کیا جاتا ہے، نظام عدل کو قائم رکھنے کے نام پر ظلم کو برقرار کیا جاتا ہے، تاریخ انسانیت میں جو ناپاک ترین گناہ اب تک انجام دیا جارہا ہے وہ ہے "عدل کے نام پر ظلم" ایک گناہ کے ضمن میں کئی گناہ انجام پاتے ہیں۔

عدل کے نام پر ظلم کا اجراء قبیح گناہ ہے ، قابل نفرت جھوٹ ہے، ناپاک ریاکاری ہے، فریب کاری ہے، شفقت سے معمور انسانی جذبات کا استثمار ہے، دوسرے لوگوں کو ظلم کی تعلیم دینے اور مکتب ظلم و ستم کا سنگ بنیاد ہے۔

یہ منحوس گناہ استبدادی حکومتوں میں رائج چلا آرہا ہے ایسی استبدادی حکومتوں نے آزادی کے نام پر آزادی کا گلہ دبا دیا، اسلام کے نام پر اسلام کو پامال کیا ہے، خدا کے نام پر خدا کے خلاف کام کیا ہے، جیسا کہ خوارج نے ایسا کیا ہے، وہابیوں نے توحید کے نام پر مسلمانوں کو مشرک قرار دیا ہے، سوشلسٹ حکومتوں نے آزادی کے نام پر عوام سے آزادی کو سلب کیا ہے، ایسے لوگوں کا خطرناک ترین اسلحہ "نعرہ" ہے جس سے نوجوان نسل دھوکہ کھا جاتی ہے اور بہت حد تک استثمار کا شکار ہو جاتی ہے، کیونکہ ان کے اندر شفقت اور محبت کے طاقتور جذبات پائے جاتے ہیں، اسی لئے وہ نعروں کے جال میں بہت جلد پھنس جاتے ہیں، نوجوان نسل، منطقی بات سننے کی روادار نہیں ہوتی، کیونکہ جذبات اور منطق کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں۔ خوارج نے توحید کے نام پر عبد اللہ بن خبابؓ اور ان کی زوجہ کو شہید کیا اور حضرت علی عَلَیہِ السَّلام کو (نعوذ باللہ) کافر قرار دیا، حالانکہ عبد اللہ بن خباب صحابی رسولؐ تھے اور حضرت علی عَلَیہِ السَّلام کے بہترین ناصر و مددگار تھے۔

ایک وہابی قاضی (جج) نے کسی شخص کو حقہ پینے کے جرم میں سزائے موت کا حکم جاری کیا حالانکہ خود اس قاضی کے عمامہ کے پیچوں سے حقہ کے کچھ لوازمات بر آمد ہوئے، جس سے معلوم ہوا کہ موصوف خود حقہ کے رسیا تھے اور اپنے ہی فیصلے کے مطابق اسے بھی سزائے موت ہونی چاہیے تھی۔

یہیں سے مولائے متقیان علی ابن ابی طالب عَلَیہِ السَّلام کی عظمت اور ان کے عدل کا پتہ چلتا ہے، علیؑ دانا بھی تھے اور توانا بھی، دانشمند بھی تھے اور دانشور بھی، صاحب قدرت بھی تھے اور صاحب اقتدار بھی، ہر طرح کا ظلم کر سکتے تھے اور اپنے ہر ظلم کے لیے عذر بھی بیان کر سکتے تھے اور دلیل بھی پیش کر سکتے تھے مگر ایسا نہیں کیا۔

علیؑ کے قید خانوں کے داروغوں سے قیدیوں پر تشدد اور اذیت کا کبھی مظاہرہ نہیں ہوا، خود حضرت علی عَلَیہِ السَّلام ابن ملجم کو پہنچانتے تھے اس کے ناپاک ارادوں سے بھی باخبر تھے اور جانتے تھے کہ وہ آپ کو قتل کرنے کے لئے آیا ہے لیکن آپؑ نے اسے کچھ نہیں کہا، جرم سے پہلے قصاص لینے کے روادار نہیں ہوئے، اسے قید میں نہیں ڈالا، جرم سے پہلے سزا کے قائل نہیں تھے، ارادہ جرم کرنے والے کو "مجرم" نہیں سمجھتے تھے۔

عدل کی قسمیں

عدل کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔انفرادی عدل　　　　۲۔اجتماعی عدل　　　　۳۔سرکاری عدل

۱۔انفرادی عدل

اس وقت عمل میں آتا ہے جب افراد کا افراد کے درمیان کسی قسم کا کوئی ربط ہو اور ایک فرد دوسرے فرد کے ساتھ اس وقت عدل سے کام لے جب دوسرے کا اس پر کوئی حق بنتا ہو اور وہ اسے ادا کرے، دوسروں کے حقوق کا احترام کرے، خدا کے احکام پر عمل کرے، اس کی نہی کے سامنے ظاہر اور باطن میں سر تسلیم خم کرے۔

بقول شاعر۔　　ملحد گرسنہ و خانہ خالی و طعام

عقل باور نکند کہ رمضان اندیشد

غیر عادل ہو اور بھوکا ہو، گھر بھی خالی ہو اور کھانہ بھی موجود ہو تو عقل کبھی نہیں مان سکتی کہ وہ رمضان کا کچھ خیال کرے (کہ کھانا نہ کھائے)

غیر عادل بھوکے کو قدرت پر قدرت حاصل نہیں ہوتی، خواہشات نفسانی پر قابو پانے کی قدرت نہیں رکھتا، اسی لئے عقل نہیں مان سکتی کہ اسے رمضان المبارک کے احترام کا کوئی احساس ہو، جبکہ عادل دونوں طرح کی قدرت رکھتا ہے اور اس کے بارے میں عقل باور کر سکتی ہے کہ اسے ماہ رمضان کے

احترام کا احساس ہو، رمضان کے بارے میں احساس در حقیقت خدا کے بارے میں احساس ہوتا ہے، اسی کا نام پرہیز گاری ہے اور اسی کا نام تقویٰ ہے۔

۲۔ اجتماعی عدل

فیصلہ کرنے کے بارے میں عدل ہوتا ہے، فیصلہ کرنے کے وقت قاضی (جج) دو چیزوں سے بالکل دور ہوتا ہے

(۱) دوستی سے (۲) دشمنی سے

وہ ہمیشہ غیر جانبدار ہو کر فیصلہ کرتا ہے، اس بارے میں اس کے لئے دوست اور دشمن برابر ہوتے ہیں، دوست کا معاون اور دشمن کا مخالف نہیں ہوتا، قضا کا منصب نہایت ہی مقدس منصب ہوتا ہے، اس کی شرائط مرجع تقلید کی شرائط سے کہیں زیادہ ہیں، اسی لیے قضاوت، مرجعیت پر فوقیت رکھتی ہے، قاضی کے لئے دوستی اور دشمنی، برحق فیصلہ کرنے کے لئے آڑے نہیں آتی جبکہ مرجعیت کے لئے ایسا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، قاضی (جج) مجتہد ہونا چاہیے لیکن متعصب نہیں ہونا چاہیے مبادا تعصب اس کے فیصلے میں آڑے آئے۔

فیصلہ کرتے وقت قاضی کو بھوکا یا پیاسا نہیں ہونا چاہیے، اور نہ ہی اسے رفع حاجت کی ضرورت ہو، اسے بالکل غیر جانبدار ہونا چاہیے، اس کی کسی فریق کے ساتھ وابستگی نہیں ہونی چاہیے، اسے کسی پارٹی، انجمن یا گروہ سے وابستہ یا رکن

نہیں ہونا چاہیے، قاضی ہونا بہت ہی خطرناک ہے کسی قسم کی خواہش یا غضب اور غصہ کو اس کے فیصلہ میں دخل انداز نہیں ہونا چاہیے۔

قاضی کو اپنے نفس پر قابو ہونا چاہیے، اس پر کسی قسم کی صورت حال کو اثر انداز نہیں ہونا چاہیے، کسی طاقتور کی طاقت، یا کسی کمزور کی کمزوری کو اس کے فیصلے میں اثر انداز نہیں ہونا چاہیے۔

قاضی کو شادی شدہ ہونا چاہیے تا کہ کسی قسم کا جنسی میلان اس کے فیصلے میں مؤثر نہیں ہونا چاہیے۔

قاضی کو شہرت طلب اور نام و نمود کا دلدادہ نہیں ہونا چاہیے اسے لوگوں کے افکار و خیالات کے مسخر و استحصال کرنے کی خواہش نہیں ہونی چاہیے۔

عدلیہ کو حکومت سے الگ ہونا چاہیے ان دونوں کا اتحاد ملک و ملت کے لیے بہت ہی خطرناک ہے، اور خود قاضی کے لیے زیادہ خطرناک ہے۔ مذکورہ بالا شرائط کا قاضی میں ہونا اور اس کے ساتھ ہی اسے مجتہد ہونا علی عَلَیہِ السَّلَام کو نہایت پسند ہے، اور دین اسلام اس طرح کی قضاوت کو عالم بشریت کے لئے تحفہ کے طور پر پیش کرتا ہے۔

ا۔ ایک شخص نے خلیفہ ثانی کی حکومت میں علی عَلَیہِ السَّلَام کے خلاف دعویٰ دائر کر دیا اور خلیفہ نے آپؑ کو طلب کیا اور کہ: یا ابا الحسن! آپ فریق مخالف کے ساتھ بیٹھ جایئے تا کہ مقدمہ کا آغاز کیا جائے، یہ سن کر مولا علی عَلَیہِ السَّلَام کے چہرے

پر پریشانی کے آثار نمایاں ہوئے، خلیفہ نے پوچھا: آیا اس وجہ سے پریشان ہو گئے کہ میں نے آپ سے کہا ہے کہ "اپنے مخالف فریق کے ساتھ بیٹھ جائیں" فرمایا؛نہ! ہر گز ایسا نہیں ہے بلکہ میری پریشانی اس وجہ سے ہے کہ آپ نے میرا احترام کے ساتھ نام لیا ہے اور اس کے ساتھ آپ نے ایسا سلوک نہیں کیا(وسائل الشیعہ شیخ حر عاملی جلد ۸ ص ۱۵۷ حدیث ۳۳۶۰۱)

مقدمہ کے دونوں فریقوں کی نسبت قاضی کو غیر جانبدار ہونا چاہیے۔

۲۔ایک مرتبہ ایک انجان شخص حضرت علی عَلَیْہِ السَّلَام کا مہمان ہوا، اور چند روز تک آپ کے پاس رہا، در حقیقت اس کو ایک شخص کے خلاف دعویٰ دائر کرنا تھا جس کے وہ انتظار میں تھا تاکہ وہ آجائے اور حضرت کی عدالت میں مقدمہ پیش کیا جائے، جب حضرت علی عَلَیْہِ السَّلَام کو اس کے مقصد کا علم ہو گیا تو نہایت ہی مہربانی کے ساتھ اس سے عذر خواہی کی اور اس سے کہا "حضور پیغمبر خدا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے فرمایا ہے کہ قاضی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ مقدمہ کے کسی فریق کو اپنا مہمان بنائے، تاوقتیکہ دوسرا فریق بھی اس کا مہمان بنے،(لہٰذا آپ یہاں سے تشریف لے جائیں)

۳۔سرکاری عدل

اس سے مراد امور مملکت کو چلانا، سرکاری اداروں پر نگاہ رکھنا اور ان میں عدل و انصاف قائم کرنا، اور ملک میں امن و امان قائم رکھنا اس کی اصل ذمہ

داری ہے، عوام کو تحریر اور تقریر کی آزادی روز گار اور کاروبار کی آزادی، سفر و حضر کی آزادی، کسب و کار اور اپنے پیشے کی آزادی، یہ سب قومی حقوق میں شامل ہیں، جس کی ذمہ داری سرکاری عدلیہ پر عائد ہوتی ہے اور اسے یہ حکومت سے دلانا ہوتی ہے۔ انسان کی آزادی اس کے بنیادی حقوق میں شامل ہے، یعنی ریاست کا ہر فرد آزاد اور خود مختار ہے بشرطیکہ یہ آزادی دوسروں کی آزادی سے متصادم نہ ہو۔

سرکاری عدل اس وقت مؤثر ہوتا ہے جب حکومت یا حکمرانوں کی طرف سے کسی کا حق پامال نہ ہو، بڑے اور طاقتور لوگوں کی طرف سے بے کس اور بے بس افراد پر ظلم نہ ہو، اگر بوڑھی عورت زر و جواہر یا زیورات کی ایک بوری اپنے ساتھ لے کر ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اکیلے سفر کرے تو کسی کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے کہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ لے۔

حضرت علی عَلَیہِ السَّلام کی عدل پرور حکومت اسی طرح کی تھی کہ کسی کو کسی سے کوئی سروکار نہیں تھا، نہ کسی پر ظلم کرتا تھا، اس لیے کہ خود علی عَلَیہِ السَّلام ہی ایسے بے کسوں اور بے چاروں کے فریاد رس اور ان کی پناہ گاہ تھے۔

آپ کے دور حکومت میں عوام نے جو آرام و آسائش دیکھی، اور آزادی سے بہرہ ور ہوئے، علی عَلَیہِ السَّلام کا خدا بھی یہی کچھ چاہتا تھا، اور ایسی بے نظیر و بے مثال حکومت تھی جو آج تک کسی قوم اور ملت کو نصیب نہ ہو سکی۔

"سودہ" نامی ایک خاتون بیان کرتی ہے کہ:

ایک مرتبہ میں مولا علی عَلَیہِ السّلام کی خدمت میں ان کے ایک کارندے کی شکایت لے کر حاضر ہوئی، اس وقت آپ نماز پڑھ رہے تھے، جب مجھے دیکھا تو اپنی نماز کو مختصر کر کے میری طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا کہ کیسے آنا ہوا؟ میں نے ان سے ان کے کارندے کی شکایت کی، یہ سن کر آپ پر گریہ طاری ہو گیا اور کہنے لگے پروردگار! تو میرے اور میرے کارندوں کے کاموں کا گواہ ہے، میں نے انہیں کسی پر ظلم کرنے کے لیے مقرر نہیں کیا، پھر اسی وقت آپ نے چمڑے کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور اس پر اس کی معزولی کا حکم لکھ کر مجھے دیا کہ یہ جا کر پہنچا دے (بلاغات النساء ابن طیفور ص ۱۳۱ اعلام النساء عمر رضا کحالہ ج ۲ ص ۲۷۰)

علی عَلَیہِ السّلام کی عدل پرور حکومت میں یہ بات تو جائز تھی کہ کوئی سرکاری عہدہ خالی پڑا رہے لیکن یہ بات جائز نہیں تھی اسے کسی ظالم کے سپرد کیا جائے، صحیح معنوں میں کسی اہل کار کے نہ ملنے کی وجہ حکومتی کام معطل رہ جائیں بہتر ہے اس سے کہ وہ غلط کار لوگوں کے ذریعے انجام دیئے جائیں کیونکہ یہ اس سے بدتر ہے۔

ایک مرتبہ حضرت امیر المومنین عَلَیہِ السّلام خرما فروشوں کے بازار سے گزر رہے تھے اور دیکھا کہ ایک عورت وہاں پر رو رہی ہے، آپ نے اس سے رونے کا سبب پوچھا، اس نے کہا کہ صاحب خانہ نے مجھے کھجوریں لینے کے لیے بھیجا اور میں کچھ کھجوریں خرید کر گھر گئی لیکن گھر والوں نے وہ پسند نہیں کیں، میں واپس لے

آئی لیکن دوکاندار واپس نہیں لیتا، حضرت نے دوکاندار کی طرف منہ کر کے فرمایا: بندہ خدا! یہ بیچاری ایک نوکرانی ہے، یہ اس کا اپنا مال نہیں ہے، مالک نے واپس کر دیا ہے تم اس سے یہ کھجوریں لے کر اس کے پیسے واپس کر دو، یہ سن کر وہ شخص اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور آپ کے سینے پر ایک مکا رسید کر دیا، آپ کے ساتھیوں نے کہا "شرم کرو' امیر المومنین ہیں!" یہ سن کر اس کا رنگ فق ہو گیا اور فوراً کھجوریں لے کر پیسے واپس کر دیئے اور حضرت کی خدمت میں کہا "امیر المومنین! آپ مجھے معاف کر دیں" یہ سن کر آپؑ نے فرمایا کہ جب تو نے ان لوگوں کا حق ادا کر دیا ہے تو میں تجھ سے کیوں نہ راضی ہوں۔(بحارالانوار جلد ۴۱ص۴۸)

گویا سینے پر مکے کی بات نہیں تھی اور نہ ہی آپؑ کے ساتھ بے ادبی ہوئی ہے، بلکہ یہاں پر عدل "زیتون کی شاخ کے ساتھ" کا عملی مظاہر ہو رہا ہے۔

ایک دن سخت گرمیوں کے موسم میں کہیں سے اپنے گھر آرہے تھے کہ اچانک ایک عورت کو دیکھا جو رو رہی تھی، جو اپنے شوہر سے ڈر کے بھاگ آئی تھی، اور آپ کی خدمت میں اس کی شکایت کی، حضرت نے فرمایا کنیز خدا! ذرا ٹھہر جاؤ، تاکہ دن ٹھنڈا ہو جائے پھر میں تمہارے ساتھ تمہارے شوہر کے پاس چلوں گا، اس نے کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ دیر ہو جائے اور اس کا غصہ مجھ پر اور زیادہ ہو جائے، یہ سن کر آپ نے اپنا سر جھکا لیا اور کچھ دیر کے بعد سر اٹھا کر کہا "نہ! نہ!! خدا کی قسم مجھے مظلوم کا حق ابھی لینا چاہیے! پوچھا: کنیز خدا تمہارا گھر کہاں ہے؟ یہ

سن کر اس عورت نے آپ کو اپنے گھر کا راستہ بتا دیا اور وہاں پہنچ گئے، امام نے بلند آواز کے ساتھ گھر کے دروازے پر سلام کیا، سلام کی آواز سن کر وہ مرد گھر سے باہر آیا، حضرت نے اس سے فرمایا "بندہ خدا، خدا سے ڈرو، تم نے اپنی زوجہ کو ڈرا دھمکا کے گھر سے نکال دیا! اس نے گستاخانہ لہجے میں آپ سے کہا کہ " تمہیں اس سے کیا؟ اب جب تم نے اس کی سفارش کی ہے میں اسے آگ میں جلا دوں گا" مولا علی عَلَیہِ السَّلام نے غضبناک ہو کر فرمایا " میں تمہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کر رہا ہوں اور تم ہو کہ میرے ساتھ منکر کا سلوک کر رہے ہو اور معروف سے منہ موڑ رہے ہو! اتنے میں لوگ اکھٹے ہو گئے اور آپ پر " السلام علیک یا امیر المومنین " کہہ کر سلام کرنے لگے، وہ شخص اب مولا کو پہچان گیا اور شرمسار ہوا، عرض کیا، یا امیر المومنینؑ! آپ مجھے معاف فرمادیں، آئندہ اپنی زوجہ کے لئے خاکسار رہوں گا،

اس کے بعد مولا نے اس خاتون کی طرف منہ کر کے کہا: اے کنیز خدا! جاؤ، گھر کے اندر چلی جاؤ، اور آئندہ کے لئے کوئی ایسا کام نہ کرنا کہ جس سے تمہارے شوہر کو غصہ آ جائے اور تمہارے ساتھ دوبارہ ایسا سلوک کرے۔ (بحارالانوار جلد ۴۱ ص ۵۷ منقول از مناقب آل ابی طالب)

حضرت علی عَلَیہِ السَّلام کا سرکاری عدل

حضرت علی عَلَیہِ السَّلام کے سرکاری عدل کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ آپ نے اپنی حکومت کے دوران اپنے دشمنوں سے بھی آزادی سلب نہیں کی جو معروف دشمن تھے وہ بھی کوفہ میں آزادی کے ساتھ رہ رہے تھے، صرف یہی نہیں بلکہ حضرت سے شرم وحیا کئے بغیر آپ کی موجودگی اور عدم موجودگی میں آپ کی شکایات بھی کرتے رہتے تھے حتیٰ کہ بعض اوقات تو بے ادبی کی نوبت بھی پہنچ جاتی تھی، پھر بھی آپ نے ان سے نہ تو خود اپنے ہاتھوں سے انتقام لیا اور نہ ہی اپنے دوستوں کے ذریعے سے اور دوستوں کو یہ اجازت بھی نہیں تھی کہ کبھی بھی آپ کو مطلع کئے بغیر انہیں ان کی کسی قسم کی بے ادبی کا جواب دیں، یا انہیں تنبیہ کریں۔

ایک مرتبہ آپ ایک مجمع میں تشریف فرما تھے کہ ایک خوبصورت عورت کا وہاں سے گزر ہوا، لوگوں نے انہیں کن اکھیوں سے دیکھنا شروع کر دیا، جب امام نے ان کی یہ کیفیت دیکھی تو فرمایا: "ان مردوں کی آنکھیں بھوکی ہیں اور ہوس کے مریض ہیں اور یہی چیز انہیں بدبخت کرتی ہے لہٰذا تم میں سے جس شخص کا دل جب کسی عورت کو چاہے تو اسے چاہیے کہ اپنی بیوی کے پاس چلا جائے کیونکہ وہ بھی دوسری عورتوں کی طرح ایک عورت ہے"

اس مجمع میں ایک بد طینت انسان بھی بیٹھا ہوا تھا، حضرت کے ناصحانہ کلمات اسے ناگوار گزرے اس نے گستاخانہ لہجے میں کہا "واہ! یہ کافر کس قدر دانشور ہے، خدا اسے غارت کرے" (معاذ اللہ، نقل کفر، کفر نباشد)

جب حاضرین نے اس کی یہ بکواس سنی تو اسے قتل کرنا چاہا لیکن حضرتؑ نے انہیں روک دیا اور فرمایا "اس نے مجھے گالی دی ہے اور گالی کی سزا گالی ہے۔ لیکن میں اسے معاف کرتا ہوں (بحارالانوار ج ۴۱ ص ۴۹ منقول از مناقب آل ابی طالب) اسے کہتے ہیں "شاخ زیتون کے ساتھ عدل کا اجراء۔"

ایک اور واقعہ

ایک مرتبہ آپ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ کہیں بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک گوہ وہیں پر نمودار ہوئی، ایک بد فطرت شخص نے اسے دیکھ کر کہا "یا امیر المومنین ! آپ اپنا ہاتھ بڑھائیں کہ میں آپ کی بیعت کروں ! (نعوذ باللہ) اس طرح سے اس نے امام عَلَیہِ السَّلام کی توہین کرنا چاہی، لیکن امام عالی مقام عَلَیہِ السَّلام نے اس کی اس بد زبانی پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں فرمایا۔

ابن کوّا کا واقعہ

ابن کوّا، خوارج کے سر کردہ لوگوں میں سے تھا اور حضرت علی ابن ابی طالب عَلَیہِ السَّلام کے بارے میں سخت گستاخ تھا وہ آپؑ کے سامنے زبان درازی کیا کرتا

تھا اور حکومت علی عَلَیہِ السَّلَام میں آزادی بیان کا غلط فائدہ اٹھایا کرتا تھا، بعض اوقات وہ آپؑ سے مسجد یا کسی مجلس میں آپ کو تنگ کرنے کے لیے مشکل آیات اور مبہم مسائل بھی پوچھا کرتا تھا۔ ایک دن امام عَلَیہِ السَّلَام کے پیچھے نماز پڑھ رہا تھا اور باآواز بلند اس نے سورہ زمر کی آیت ٦٥ کی تلاوت شروع کر دی(وَلَقَدۡ اُوۡحِیَ اِلَیۡكَ وَاِلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِكَ ۚ لَىِٕنۡ اَشۡرَكۡتَ لَیَحۡبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ)یعنی" یقینا آپ کی طرف اور ان لوگوں کی طرف وحی کی گئی ہے جو آپؐ سے پہلے انبیاء تھے کہ :اگر تم نے شرک کیا تو تمہارے عمل ضرور تباہ ہو جائیں گے ،اور تم خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو گے"

اس سے اس کا یہ بتانا مقصود تھا کہ "یا علی !(نعوذ باللہ) آپ مشرک ہو گئے ہیں اور خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہیں"

جب وہ آیت پڑھ رہا تھا تو حضرتؑ نماز میں خاموش ہو گئے، جب اس نے آیت کو مکمل کر لیا تو آپ نے نماز پڑھنا شروع کر دی، لیکن اس نے پھر اس آیت کو پڑھا تو آپ خاموش ہو گئے، جب اس نے آیت کو پڑھ لیا تو آپؑ نے نماز پڑھنا شروع کر دی، مگر اس نے تیسری مرتبہ اسی آیت کو دہرایا تو امیر المومنین عَلَیہِ السَّلَام نے سورہ روم کی آخری آیت تلاوت فرمائی(فَاصۡبِرۡ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا یَسۡتَخِفَّنَّكَ الَّذِیۡنَ لَا یُوۡقِنُوۡنَ)یعنی "اے پیغمبر صبر سے کام لیں، یقینا اللہ کا وعدہ حق ہے اور جو راہ حق پر یقین نہیں رکھتے وہ آپ کو سبک نہ سمجھنے لگ جائیں" یہ کہہ کر آپ نے نماز کو جاری رکھا۔

خطبہ ہمام

جناب ہمام آپ علیہ السلام کے قریبی دوستوں میں سے تھے انہوں نے آپؑ سے موعظہ کی درخواست کی تو حضرتؑ نے موعظہ کے لیے چند جملے ارشاد فرمائے، لیکن ہمام نے مزید تفصیل سے بیان کرنے کی خواہش کی تو آپ علیہ السلام چند جملے تفصیل سے بیان فرماہی رہے تھے کہ موعظہ نے اس قدر اثر کیا کہ انہوں نے چیخ ماری اور ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی، یہ حالت دیکھ کر امام نے فرمایا: بلیغ موعظہ ایساہی اثر کرتا ہے (نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۳ المعروف خطبہ ہمام)

ایک کم ظرف بد فطرت انسان وہاں پر موجود تھا اس نے کہا؛"جناب اس کا اثر خود آپ پر کیوں نہیں ہوا؟"

ایک مرتبہ امام علیہ السلام مسجد میں خطبہ ارشاد فرمارہے تھے کہ مسجد کے کونے سے حضرت کے خلاف نعرہ بلند ہوا" لا حکم الا للہ "یعنی حکومت صرف خداوند ہی کا کام ہے لہٰذا یا علیؑ آپ کو حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے مگر امام علیہ السلام نے اس کے جواب میں صرف یہی کلمہ کہا"کلمة حق یراد بها الباطل "یعنی بات تو سچی ہے لیکن اس سے مراد باطل لیا جارہاہے، گویا آپ نے نعرے کا جواب صرف بات سے دے دیا۔

(نہج البلاغہ خطبہ ۴۰ ص ۸۲، حکمت ۱۹۸ ص ۵۰۴)

ایسے نعرے سے مخالفوں کا مقصد حضرت علی عَلَیہِ السَّلَام کی حکومت کا خاتمہ اور لوگوں کو دھوکہ دینا تھا گویا حضرت علی عَلَیہِ السَّلَام کے ساتھ ان کی دشمنی کا مقصد یہی تھا لیکن اس کے مقابلہ میں حضرت علی عَلَیہِ السَّلَام کا ردعمل یہ تھا!!

حضرت علی عَلَیہِ السَّلَام کے دور حکومت میں کوئی شخص حاکم وقت سے نہیں ڈرتا تھا پست فطرت لوگ جو کسی سے نہیں ڈرتے وہ اس پر ظلم کرتے ہیں لیکن ایسے ہی لوگوں نے حضرت علی عَلَیہِ السَّلَام پر بہت ظلم کیا آیا کسی نے مقتدر اور قدرت مند حاکم کو دیکھا ہے کہ جس پر رعیت ظلم کر رہی ہو سوائے علی ابن ابی طالبؑ کے!؟

حکومت علی عَلَیہِ السَّلَام کا ایک اور شاہکار

حضرت علی عَلَیہِ السَّلَام کی عادلانہ حکومت کا ایک اور شاہکار یہ ہے کہ امام عالی مقامؑ نے عوامی جذبات سے ناجائز مفاد نہیں اٹھایا اگر وہ چاہتے تو ایسا کر سکتے تھے مگر نہیں کیا، اس لیے کہ جذبات سے ناجائز مفاد حاصل کرنا عقل پر ظلم ہوتا ہے ناکہ جسم، مال وجاہ ومنصب اور عزت وآبرو پر۔

عوام کے جذبات سے فائدہ اٹھانا علی عَلَیہِ السَّلَام جیسی شخصیت کے لیے بہت آسان تھا کیونکہ آپ کے پاس ہر طرح کے ذرائع تھے مگر آپ نے ایسا نہیں کیا، اس سلسلے میں آپ کے پاس کسی قسم کی کمی تھی؟ مقرر تھے تو کمال

کے، دانشور تھے تو عظیم، عالم تھے تو مدینۃ العلم کے باب تھے، دلاور تھے تو بے نظیر و بے مثیل تھے، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یار و مدد گار تھے، روشن ماضی کے حامل تھے، بے داغ کردار کے مالک تھے، عظیم مفکر اور دانشمند تھے، اس قدر فضائل و اَقدار کے مالک تھے کہ ان میں سے صرف ایک فضیلت یا کمال لوگوں کے جذبات سے مفاد اٹھانے کے لیے کافی تھا کہ لوگوں کے جذبات سے بہت جلدی فائدہ اٹھا سکتے تھے اس طرح سے ان کی حکومت کے مخالف کا وجود بھی نہ ہوتا اور بڑے سکون کے ساتھ حکومت کر سکتے تھے مگر ایسا ہرگز نہیں کیا، کر سکتے تھے مگر نہیں کیا، جانتے تھے مگر پھر بھی نہیں کیا، اور جان بوجھ کر نہیں کیا۔

عوام الناس خاص کر نوجوانوں کے جذبات سے ناجائز مفاد اٹھانا، انسانیت کے ساتھ بدترین خیانت ہے لیکن علی علیہ السلام تو خادم انسانیت تھے، خائن انسانیت نہیں تھے، اگر علی علیہ السلام جذبات سے ناجائز مفاد اٹھانا چاہتے تو تمام عمومی افکار کو مسخر کر سکتے تھے، اپنے ملک اور حکومت میں ان کا کوئی ایک بھی مخالف باقی نہ ہوتا، اور اپنے مقاصد میں سو فیصد کامیاب ہو جاتے اور آپ کے خلاف کوئی چھوٹی سے چھوٹی سازش بھی کامیاب نہ ہوتی، اور آپ کی حکومت کے خلاف کسی بھی قسم کی کوئی تحریک نہ پنپ سکتی۔

لوگوں کی مرضی کے مطابق بات کرنی، منطقی گفتگو کے بجائے نعروں پر اکتفا کرنا، حق گوئی سے سکوت اختیار کر کے لوگوں کو اپنے سکوت کے ذریعہ

ناشائستہ کاموں پر قائم رکھنے کا کام ہر شخص کر سکتا ہے لیکن ابو طالب عَلَیہِ السّلام کا فرزند ایسا نہیں کر سکتا تھا۔

ابھی بتا چکے ہیں کہ عورت کو کن انکھیوں کے ساتھ دیکھنے والوں کی کیونکر سرزنش اور پھر ان کی راہنمائی بھی فرمائی۔

طبعی طور پر لوگوں کو وعظ و نصیحت اچھا نہیں لگتا، موعظہ کو اچھا نہیں سمجھتے، خاص کر اس وقت جب وہ براہ راست مخاطب ہوں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے دور بھاگتے ہیں، اچھے اور نیکو کار لوگوں کی زبان حال تو یہ ہوتی ہے کہ

من اگر نیکم اگر بد، تو برو خود را باش   کہ گناہ دگری بر تو نخواہند نوشت

یعنی اگر نیک ہوں یا بد آپ کو اس سے کیا، جاؤ اپنا کام کرو کیونکہ دوسروں کا گناہ آپ کے نامہ اعمال میں نہیں لکھیں گے۔

اب آپ ہی بتائیں کہ بدکاروں کی زبان حال کیا ہو گی؟

انسانی جذبات سے ناجائز مفاد اٹھانے والے، لوگوں کی اس قسم کی صفت سے فائدہ اٹھاتے ہیں، لیکن مولا علی عَلَیہِ السّلام نے ایسا نہیں کیا، لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے، غلطی کرنے والے کو روک دیتے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنی زندگی کا حصہ بنالیا تھا،

منقول ہے کہ دن کے وقت بازار چلے جاتے اور دوکانداروں کو لین دین کے بارے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرماتے۔

عوامی جذبات سے فائدہ اٹھانے والے جب کسی قسم کی لیاقت سے محروم ہوتے ہیں تو عوام فریبی سے کام لیتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں، تہمتیں لگاتے ہیں، اپنے مخالفین کو سر بازار ننگا کر دیتے ہیں، اپنی راہ میں پیدا ہونے والی رکاوٹوں کو ہر جائز و ناجائز طریقے سے دور کرتے ہیں، ملک اور قوم کے مفاد میں اچھے اور شائستہ کاموں سے دریغ کرتے ہیں، خوہ اس کے لئے انہیں بدنامی ہی کیوں نہ مول لینا پڑے، یا خیانت سے کیوں نہ متہم ہونا پڑے!!

حضرت علی عَلَیہِ السَّلام کی جوانمردی

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا شجاعت اور بہادری افضل ہے یا جوانمردی اور سخاوت؟ اس بارے میں دو طرح کی آراء ہیں کچھ دانشور پہلی کو اور کچھ دوسری کو پسند کرتے ہیں،

پہلی قسم کے لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ بہادری اور دلیری میں جان دینی پڑتی ہے اور جوانمردی و سخاوت میں مال دینا پڑتا ہے، معلوم ہے کہ مال سے جان زیادہ پیاری ہوتی ہے اس لیے مال کو جان پر قربان کیا جاتا ہے ،لہٰذا شجاعت، سخاوت سے افضل ہوتی ہے۔

دوسرے فریق کا کہنا ہے کہ شجاعت میں کسی کی جان لی جاتی ہے جبکہ سخاوت میں جان کو بخش دینا ہوتا ہے، شجاعت میں کسی کی جان کو قتل کرنا ہوتا ہے اور سخاوت میں کسی کی جان کو زندہ کرنا ہوتا ہے، چونکہ زندہ کرنا، مارنے سے بہتر ہے لہٰذا سخاوت افضل ہے۔

حق پر کون ہے اور کون نہیں؟ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں، لیکن جو حق بات ہے وہ یہ کہ دونوں صفات حضرت امیر المومنین عَلَیہِ السَّلام میں بدرجہ اتم موجود تھیں، یہ صفت بھی موجود تھی اور وہ صفت بھی،

کیونکہ علی عَلَیہِ السَّلام۔۔۔

جان می باخت و جان می بخشید   گیرندہ جان بود و بخشندہ جان

جان دیتے بھی تھے اور جان بخشتے بھی تھے، جان لینے والے بھی تھے اور جان کے بخشنے والے بھی تھے۔

عرب کا شاعر کہتا ہے کہ

"لَیسَ عَلَی اللهِ بِمُستَنکَرٍ أَن یَّجمَعَ العَالَمَ فِي وَاحِدٍ"

یعنی "خدا کے لیے یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے کہ فضیلتوں کی پوری کائنات کسی ایک شخصیت میں جمع کر دے"

"آنچہ خوبان ہمہ دارند علی عَلَیہِ السَّلام تنہا داشت "جو فضائل دیگر عظیم ہستیوں میں الگ الگ پائے جاتے وہ سب تنہا علی عَلَیہِ السَّلام میں پائے جاتے تھے، لیکن جو فضائل علی عَلَیہِ السَّلام میں پائے جاتے تھے وہ ان سب میں سے کسی میں یکجا نہیں پائے جاتے تھے، علیؑ علیؑ تھے، سب اچھوں سے بالا تر اچھے، دو ظاہری آنکھوں سے دیکھنے میں تو علیؑ ایک تن نظر آتے تھے لیکن عقل کی آنکھوں سے دیکھنے میں وہ ہزاروں سے زیادہ تھے، علی بظاہر تو دیکھنے میں ایک "تن" تھے لیکن دنیا کے تمام "تنوں" میں ان کے جیسا کوئی نہیں تھا، علی کو اس مشہور ضرب المثل سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ

چراغی کہ بخانہ رواست بمسجد حرام است

تا نیاز ھست جائے بخشش نیست

یعنی "جو چراغ گھر میں جائز ہوتا ہے وہ مسجد میں حرام ہوتا ہے یعنی جب تک خود کو ضرورت ہے دوسروں کو عطا نہیں کیا جا سکتا"

وہ خود ضرورت مند ہوتے پھر بھی عطا کرتے اور اگر ضرورت مند نہیں ہوتے پھر بھی عطا فرماتے تھے، اس بارے علی عَلَیہِ السَّلام ضرورت مندوں کو دیکھتے تھے خود کو نہیں دیکھتے تھے۔

مقدادؓ کے گھر سے فاقے دور کئے

حضرت علی عَلَیہِ السَّلام کو اطلاع ملی کہ حضرت مقدادؓ کے گھر میں فاقے ہیں اور بھوک نے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں، تو فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے، اپنی زرہ کو پانچ سو درہم میں بیچا اور مقدادؓ کے گھر سے فاقوں کو دور کیا (مناقب آل ابی طالب ج ۲ ص ۷۸)

آپؑ نے زرہ کو اس لیے بیچا کہ اس وقت آپ کا ہاتھ خالی تھا۔

ابوہریرہؓ کا پیٹ بھرا

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ مدینہ میں قحط سالی ہوگئی، ہمیں پورے ایک دن رات سے کھانا نصیب نہیں ہوا، بھوک سے برا حال تھا، میں حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ مل کر ان کے گھر گیا شاید کچھ کھانے کو مل جائے لیکن وہاں سے ناامید ہو کر پلٹ آیا، دوسرے دن حضرت عمرؓ کے ساتھ ان کے گھر گیا مگر وہاں سے مایوس ہو کر واپس آ گیا، تیسرے روز حضرت علی عَلَیہِ السَّلام کے ہمراہ ان

کے گھر گیا وہاں پر جی بھر کر کھانے کو مل گیا، چنانچہ سیر ہو کر واپس آ گیا(بحارالانوار جلد ۲۱ ص ۲۷)

یتیموں کو شہد کھلایا

ابو طفیل کہتے ہیں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ علی علیہ السلام یتیم بچوں کو اپنے گرد اکٹھا کر کے انہیں شہد کھلا رہے تھے(بحارالانوار ج ۲۱ ص ۲۹)

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بھوک مٹائی

حضرت علی علیہ السلام نے ایک دن دیکھا کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کافی بھوکے ہیں اور خود وہ بھی بھوکے تھے، اور گھر میں کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا، لہٰذا آپ کام کی تلاش میں باہر نکل گئے، ایک جگہ دیکھا کہ ایک شخص اپنے اونٹ کے ذریعے کنویں سے پانی نکال کر کھجور کے درختوں کو پانی پلا رہا تھا، آپ نے اس سے فرمایا" میں تمہارے لئے کام کرنے کے لئے تیار ہوں کہ کنویں سے پانی نکال دوں اور ہر ڈول کے بدلے کھجور کا ایک دانہ مزدوری لوں، اس شخص نے آپ کی پیشکش کو قبول کیا، آپ نے پانی نکالنا شروع کر دیا جب خرما کے دانوں کی تعداد اتنی ہو گئی کہ انہیں دونوں ہاتھوں میں لے سکتے ہیں تو آپ نے کام بند کر دیا، اور کھجوروں کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بھیج دیا(بحارالانوار ج ۴۱ ص ۳۹ منقول از مناقب آل ابی طالب)

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کھجوریں خود امیر المومنین عَلَیہِ السَّلام حضور کی خدمت میں کیوں نہ لے گئے؟ اس لیے کہ ہو سکتا ہے حضور رسالت مآب صَلَّى اللهُ عَلَيهِ وَآلِهِ وَسَلَّم ان سے پوچھ لیتے کہ یا علیؑ! آپ یہ کھجوریں کہاں سے لائے ہیں؟ علی عَلَیہِ السَّلام مزدوری کرنے والے تھے اور وہ شخص مزدوری کرانے والا تھا لیکن آج علی عَلَیہِ السَّلام نے مزدوری کر کے مزدوروں کا سر فخر سے بلند کر دیا اور ان کے لئے باعث افتخار ہو گئے۔

ایک عجیب واقعہ

منقول ہے کہ جب آپ مکہ مکرمہ میں تھے ایک عربی کو دیکھا جو غلاف کعبہ کو پکڑ کر خداوند عالم سے چار ہزار درہم کی دعا کر رہا تھا، امام نے اس سے چار ہزار کے عدد کے بارے سوال کیا کہ چار ہزار درہم ہی کیوں؟ کہا: ایک ہزار سے قرض چکاؤں گا، ایک ہزار کا مکان خریدوں گا، ایک ہزار درہم زوجہ کا حق مہر ادا کروں گا اور ایک ہزار سے کاروبار کر کے اپنے گھر کا خرچ چلاؤں گا" امام نے اس سے فرمایا "جب مدینہ آؤ تو مجھ سے ضرور ملنا" چنانچہ وہ جب مدینہ پہنچا اور وہاں پر موجود کچھ بچوں سے آپ کا پتہ دریافت کیا، یہ دیکھ کر ایک بچے نے کہا آؤ میں آپ کو حضرت علی عَلَیہِ السَّلام سے ملاتا ہوں، اس نے پوچھا" آپ کون ہیں؟" بچے نے کہا میں ہوں حسینؑ، علی کا بیٹا،

چنانچہ جب وہ حضرت امیر علیہ السلام کی خدمت میں پہنچا اتفاق سے اس وقت آپ کا ہاتھ خالی تھا، فوراحضرت سلمانؓ کو بلایا اور فرمایا کہ "ہمارے کھجوروں کے باغ میں جا کر ان درختوں کو بیچ دو"، سلمانؓ نے تعمیل امر کی، اور جلد ہی وہ درخت بارہ ہزار درہم میں فروخت ہو گئے، اور جناب سلمانؓ نے وہ قیمت لا کر مولا علی علیہ السلام کے ہاتھوں پر رکھ دی، امام نے چار ہزار درہم سائل کو عطا فرمائے (بحار الانوار جلد ۱۴ ص ۴۵، ۴۴)

مدینہ کے غریبوں کی امداد

ایک مرتبہ مدینہ کے غریبوں کو معلوم ہوا کہ حضرت علی علیہ السلام کے پاس کچھ رقم تقسیم کے لئے آئی ہوئی ہے تو انہوں نے آپ کو گھیر لیا اور رقم کی درخواست کی، آپ وہ رقم مٹھی بھر بھر کے انہیں دینے لگے، یہاں تک کہ تمام رقم ختم ہوئی اور خود خالی ہاتھ گھر واپس آ گئے۔

اپنی نئی قیمتی پوشاک راہ خدا میں دے دی

ایک مرتبہ آپ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں تشریف لائے، پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے جسم اطہر پر پھٹا پرانا لباس دیکھا تو پوچھا "وہ قیمتی پوشاک جو میں نے آپ کو دی تھی وہ "کیا ہوئی؟" عرض کیا "اللہ کے رسول! میں نے آپ کے ایک صحابی کو دیکھا جو اپنے اور اپنی بیوی کے بے لباس ہونے کی شکایت کر رہا

تھا، میں نے وہ قیمتی پوشاک اسے دے دی، اور میں جانتا ہوں کہ خداوند عالم مجھے اس سے بہتر دے گا۔

چار درہم صدقہ میں دیئے

جب آپ کے پاس کہیں سے چار درہم آئے تو آپ نے انہیں چار حصوں میں تقسیم کیا، ایک درہم رات کے وقت راہ خدا میں دے دیا، ایک دن میں راہ خدا میں خرچ کیا ایک کو مخفی طور پر اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور باقی ایک کو ظاہری کر کے لوگوں میں فی سبیل اللہ بانٹ دیا

تو اس وقت قرآن مجید کی سورہ بقرہ کی آیت ۲۷۴ نازل ہوئی

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ

یعنی "جو لوگ رات اور دن کو مخفی اور علانیہ طور پر اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے تو ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ غمگین ہوں گے" (بحارالانوار جلد ۴۱ ص ۲۵، ۲۶، ۳۳، ۳۵ منقول از تفاسیر شیعہ و سنی)

نیکی چھپا کر کی جائے یا علانیہ؟

یہ آیت کریمہ اور حضرت علیؑ کا ایسا کردار مسلمانوں کے لئے ایک راہ عمل ہے، اور نیکوکار لوگوں کو بھی گویا اس کا حکم دیا جا رہا ہے کہ وہ بھی ایسا کردار

اپنائیں، اور نیکی کو چھپا کر بھی کریں اور علانیہ طور پر بھی انجام دیں، سو فیصد نیک اعمال کو مخفی رکھنا بھی نا مناسب ہے اور مکمل طور پر اعلانیہ بجالانا بھی صحیح نہیں ہے صحیح طریقہ کار یہی ہے کہ مخفی بھی ہو اور اعلانیہ بھی ہو۔

نیک کام چھپ کر انجام دیا جائے اور کھل کر بھی بجالایا جائے یعنی باطن کو سنوارا جائے اور ظاہر کو آراستہ کیا جائے، مسلمان اپنے ظاہر کو بھی آراستہ کریں اور باطن کے سنوارنے کی بھی کوشش کریں، یعنی ان کا ظاہر بھی پاک و پاکیزہ ہو اور باطن بھی صاف ستھرا ہو۔

اس لئے تصوف کا علامتی مسلک صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کے پیروکار اچھے کاموں کو چھپا کر انجام دیتے ہیں اور برے کاموں کو کھلم کھلا بجالاتے ہیں حالانکہ درحقیقت ایسے کام برے اور گناہ نہیں ہوتے، جام کو شراب کے نام سے استعمال کرتے ہیں حالانکہ وہ شراب نہیں ہوتا، پنجگانہ نمازوں کو چھپ کر بجالاتے ہیں اور خود کو تارک الصلوٰۃ ظاہر کرتے ہیں، یہ ایسے شریف لوگ ہوتے ہیں جنہیں مخلوق کی پرواہ نہیں ہوتی، بلکہ وہ خدا کے ساتھ سروکار رکھتے ہیں، ان کا مقصد خدا ہوتا ہے لیکن ان کا راستہ غلط ہوتا ہے، گویا ہدف صحیح اور بالکل ٹھیک لیکن ذریعہ بالکل غلط اور نادرست۔

حضرت علی عَلَيْهِ السَّلَام کا راستہ ایسا نہیں ہے، اسلام اس طریقہ کار کو تسلیم نہیں کرتا، کیونکہ اسلام چاہتا ہے کہ اس کا ظاہر بھی آراستہ و پیراستہ ہو اور باطن بھی۔ ظاہر اور باطن ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں، پیراستہ ہی درحقیقت آراستہ

ہوتا ہے، گناہ کو ظاہرا انجام دینا درحقیقت حق کی حدود اور محضر الٰہی کی حرمت کو پامال کرنا ہوتا ہے، جو بذات خود ایک عظیم گناہ ہے،اور گناہ کی تعلیم دینا ہے،لوگوں کو گناہ کی انجام دہی کے لئے جرائت دلانا ہوتا ہے۔

ان باتوں سے معلوم ہو گیا ہے کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ "دین ایک قلبی معاملہ ہے لہٰذا اپنے باطن کو پاک وصاف رکھو، ظاہر کی پرواہ نہ کرو، خدا کے ساتھ اپنا رابطہ باطن میں رکھو، ظاہر کے صاف رکھنے کی ضرورت نہیں ہے وہ جیسا ہو اس کی پرواہ نہیں ہے۔

یہ نظریہ قرآن کے سراسر خلاف ہے، علی عَلَیہِ السَّلام کی راہ کے سراسر خلاف ہے اور انبیاء کی راہ کو ویران کرنا ہے۔

دین تو ایک ایسا امر ہے جس کا تعلق دل کے ساتھ بھی ہے اور دل کے باہر کے ساتھ بھی،اس کا تعلق فرد کے ساتھ بھی ہے اور معاشرے کے ساتھ بھی ہے۔دین الٰہی قانون کا نام ہے اور قانون شکنی ظاہری اور باطنی دونوں صورتوں میں ناجائز ہے، قانون کی پابندی ظاہر اور باطن دونوں میں کی جائے،جو لوگ مذہب کو ایک باطنی امر سمجھتے ہیں غلط اور ناروا سوچ کے حامل ہوتے ہیں،مذہب کا تعلق ظاہر سے بھی ہے اور باطن سے بھی۔

اگر اسلام کا تعلق فقط اصلاحِ باطن سے ہوتا تو پھر نماز باجماعت غلط ہوتی ،حالانکہ جماعت افضل عبادت ہے ، حضور رسالت ماب صَلَّی اللهُ عَلَیهِ وَآلِهِ وَسَلَّم پانچوں نمازوں کو باجماعت ادا کیا کرتے تھے ،اگر اسلام باطنی دین ہوتا تو پھر حج جیسی

عبادت بے معنیٰ ہوتی، حالانکہ اس فریضہ کے تمام مناسک آشکارا بجالائے جاتے ہیں، اور وہ بھی ببانگ دہل۔

اگر اسلام کی مالی عبادات صرف مخفیانہ صدقہ دینے کا نام ہوتیں تو پھر نہ خمس ہوتا نہ زکوٰۃ ہوتی، نہ خیراتی ادارے ہوتے، نہ ہسپتالیں ہوتیں نہ یتیم خانے ہوتے، نہ شیر خوار بچوں کے ادارے ہوتے، اگر اسلام رازداری کا نام ہوتا تو پھر نہ جہاد ہوتا، نہ حضرت علی عَلَیہِ السَّلام شہید ہوتے نہ حضرت امام حسین عَلَیہِ السَّلام جام شہادت نوش فرماتے،

بدترین غلطی وہی ہوتی ہے جو سب غلطیوں کا سرنامہ ہوتی ہے، اور وہ یوں کہ عبادات اور دیگر نیک کاموں کو صرف اور صرف ظاہر میں محصور و محدود کر دیا جائے اور خدا سے باطنی رابطہ منقطع کر لیا جائے، یہ ظاہری دکھاوے اور ریا کاری کا مسلک ہو سکتا ہے، صرف ظاہر داری تک محدود اور عوام فریبی کا سبب بن سکتا ہے، حقیقت سے عاری، بدنما اور ناپسندیدہ ہوتا ہے اس کا خواہ کسی سے تعلق ہو، کسی مقام و مرتبے سے تعلق ہو، خواہ کوئی بلند مرتبہ ہو یا پست درجے کا ہو، جوان ہو یا بوڑھا، عالم ہو یا جاہل، عربی ہو یا عجمی، ریاکار بے ایمان ہوتا ہے، خدا کی معرفت سے تہی دامن ہوتا ہے اور اس سے لوگوں کی گردنوں پر سوار ہونا مقصود ہوتا ہے۔

منافقین کا تعلق بھی اسی گروہ سے تھا قرآن مجید میں ان لوگوں کی مذمت میں بہت سی آیات نازل ہوئی ہیں، منافق لوگ اسلام کو دکھاوے کے

لئے استعمال کرتے تھے ،رسول پاک ﷺ کی رسالت کی گواہی بھی دیتے تھے لیکن وہ جھوٹ بولتے تھے ،اس لیے کہ باطنی طور پر اسلام اور قرآن کے ساتھ دشمنی کرتے تھے اور پیکر اسلام پر پشت سے خنجر کا وار کیا کرتے تھے (پیکر اسلام پر پیٹھ سے چھرا گھونپتے تھے)

مذہبی آداب ورسوم پر زور

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مذہبی آداب ورسوم پر زیادہ زور دیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ دین کو ایک تکلفات اور دکھاوے کا نام دینے لگ جاتے ہیں ،اور اسے ایک واقعی حقیقت نہیں سمجھتے، گویا ظاہر سازی، باطن کی تخریب اور دین کی بنیادوں کی ویرانی کا سبب بن جاتی ہے۔

علیؑ کاراستہ آراستہ وپیراستہ ہے

ہاں تو اے برادر عزیز علی علیہ السلام کا راستہ اطاعت خداوندی کے ذریعہ ظاہر کو آراستہ کرنے اور باطن کو معصیت الٰہی سے پیراستہ کرنے کا نام ہے۔بے سمجھ لوگ یہ باور کرتے ہیں کہ صرف دل میں خدا کو یاد رکھا جائے اور یہی اس کا راستہ ہے،،حالانکہ خدا کا راستہ صرف دل میں نہیں بلکہ دل میں بھی ہے، زبان

میں بھی ہے، اور گفتار اور کردار میں بھی ہے، مخلوق کے ساتھ رابطہ ،خدا کے ساتھ رابطے کا مصداق ہوتا ہے۔

ریاکار افراد خدا کے ساتھ رابطے کو منقطع کئے ہوتے ہیں حق کے ساتھ تو کوئی سروکار نہیں رکھتے جس سے مسلمان کا خدا کے ساتھ سروکار ہوتا ہے وہ اپنے ہر ایک عضو کے ساتھ خدا سے رابطہ میں رہتا ہے جب ہر ایک عضو خدا کے ساتھ مربوط ہوتا ہے تو عضو کا راہنما دل ہوتا ہے اگر اعضاء کا راہنما دل نہ ہو تو ان کی خدا تک رسائی نہیں ہو سکتی کیونکہ نیت ہی تو روح عبادت ہے

آمدیم بر سر مطلب

چونکہ ہم اپنے مطلب سے کافی دور جا چکے ہیں لہٰذا اب اسی کی طرف واپس آتے ہیں۔

انگوٹھی راہ خدا میں دے دی

ایک سائل مسجد کے دروازے پر آیا اور مسجد میں موجود افراد سے اپنی حاجت بیان کی لیکن کسی نے اس کا مثبت جواب نہ دیا، جبکہ علی عَلَيْهِ السَّلَام مسجد کے ایک کنارے نماز نافلہ پڑھ رہے تھے انہوں نے سائل کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور حالت رکوع میں اپنے ہاتھ کی طرف سائل کو اشارہ کیا اس نے آپ کے ہاتھ میں موجود انگوٹھی اتار لی اور خوش خوش مسجد سے باہر نکل گیا، تو اسی حالت

میں سورہ مائدہ کی آیت ۵۵ نازل ہوئی " إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُواْ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلاَةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ "یعنی تمہارا حاکم صرف اللہ ہے، اس کا رسول ہے اور وہ لوگ ہیں جو صاحبان ایمان ہیں نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔

مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تیسرے فرمانروا سے مراد صرف علی ابن ابی طالب عَلَیہِ السَّلام ہیں (احقاق الحق قاضی نور اللہ شوستری جلد ۱۴ ص ۳، آیۃ اللہ مرعشی نجفی مناقب آل ابی طالب جلد ۲ ص ۸۰)

کیونکہ اس وقت تک کسی نے نماز کے دوران اور حالت رکوع میں کسی کو کچھ نہیں دیا تھا۔

اس فرمان میں حضرت علی عَلَیہِ السَّلام کی ولایت پیغمبر خدا صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کی ولایت، خدا کے حضور اور اس کی ولایت کے ساتھ ساتھ ذکر ہوئی ہے جس طرح حضرت محمد مصطفیٰ صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم خدا کے حضور میں انسانیت کے فرمانروا ہیں اسی طرح علی ابن ابی طالبؑ بھی رسول خدا کے بعد عالم بشریت کے فرمانروا ہیں، گویا علی عَلَیہِ السَّلام رسول خدا صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کی حیات اور ممات دونوں صورتوں میں عالم بشریت کے حکم فرما اور فرمانروا ہیں، اور یہ ولایت ایک ایسا مقام و منصب ہے جو حق پاک کی جانب سے کسی کو عطا ہوا ہے۔

جی ہاں! علی عَلَیہِ السَّلام بعد از نبی صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم خیر البشر ہیں اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ اعلیٰ منصب بھی آپ کو عطا نہ ہوتا، کیونکہ الٰہی منصب شائستگی اور لیاقت کی بنا پر عطا ہوتا ہے اس کی اندھی بانٹ نہیں ہوتی۔

قرآن مجید کے اس فرمان کے مطابق رسول خدا صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے بھی اپنی ساری زندگی اس پر عمل کیا اور علی عَلَیہِ السَّلام کو کبھی دوسرے شخص کے ماتحت مقرر نہیں فرمایا جہاں بھیجا علی کو "امیر" بنا کر بھیجا۔

جس سائل نے علی عَلَیہِ السَّلام کے ہاتھ سے انگوٹھی اتاری تھی آج تک اس کی شناخت نہیں ہو سکی، آیا علی عَلَیہِ السَّلام کو پہنچانتا تھا اور یہ جانتا تھا کہ کسی ذات کا لطف و کرم علی عَلَیہِ السَّلام پر ہونے والا ہے اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ غربت اور ناداری کی حالت میں اسے انگوٹھی عطا کر رہے ہیں؟ یقیناً اگر علی عَلَیہِ السَّلام کے پاس درہم و دینار ہوتے اسے وہی دیتے تا کہ جلد اس کے کام آئیں قرآن مجید میں اپنی ضرورت کے ہوتے ہوئے یا ناداری کے عالم میں سخاوت کرنا "ایثار" کہلاتا ہے۔

تونگری اور مالداری کی صورت میں علی عَلَیہِ السَّلام کی سخاوت کی ایک الگ فصل ہے جس کے لئے تفصیل کی ضرورت ہے، بس آپ اسی سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ غربت اور ناداری کی حالت میں جس کا یہ عالم ہے تونگری اور ثروت مندی کے عالم میں اس کا کیا انداز ہو گا؟

علی عَلَیہِ السَّلام اپنی گوشہ نشینی کے عرصہ میں بھی فارغ نہیں بیٹھے رہے، کام کیا، کھیتی باڑی کی، ہزاروں درخت لگائے، اس سے انہوں نے اس قدر آمدنی

حاصل کی کہ جو سالانہ چالیس ہزار طلائی دینار سونے کے سکے تک پہنچ گئی۔ لیکن بوقت شہادت ان کے پاس کیا کچھ باقی تھا؟ مؤرخین کا اتفاق ہے کہ شہادت کے وقت آپ کے پاس صرف چھ سو درہم (چاندی کے سکے) باقی تھے۔(بحارالانوار جلد ۴۰ ص ۳۱۹، جلد ۴۲ ص ۲۰۲، ان کتابوں میں سات سو درہم درج ہیں)

جو شخص پانچ سال تک کئی ملکوں کا حاکم مطلق ہو، جس کی سالانہ ذاتی آمدنی چالیس ہزار دینار (سونے کے سکے) ہوں، جس کے لئے صرف اور صرف ایک لباس ہو، جس کی خوراک اور پوشاک سادہ اور ارزاں قیمت ہو وہ چالیس ہزار دینار سالانہ آمدنی کو کس مصرف میں خرچ کیا کرتا تھا؟ جواب صاف ظاہر ہے کہ سب کچھ راہ خدا میں ہی خرچ کیا کرتا تھا۔

حضرت علی عَلَیہِ السَّلام کی حکومت

علی عَلَیہِ السَّلام کی حکومت مہر و محبت کی حکومت تھی اور ان کی سرکار رحمت بھری سرکار تھی دوست پر بھی رحمت اور دشمن پر بھی رحمت، حکومت علیؑ حضرت محمد مصطفیؐ کی حکومت کا تسلسل تھی اور محمد مصطفیؐ کی حکومت خدا کی حکومت تھی۔ حضرت محمدؐ عالمین کے لئے رحمت اور کائنات کے لئے مہر و محبت تھے خداوند عالم ارحم الراحمین اور سب مہربانوں سے بڑھ کر مہربان ہے۔ محمد مصطفیٰ صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کا دشمنوں کے ساتھ سلوک انسانیت کے لئے سرمایہ افتخار تھا۔

قریش کا رویہ اور پیغمبر ﷺ کا سلوک

قریش نے حضور ﷺ کی ایذا رسانی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، حالانکہ آپؐ ان کے لئے ہر طرح سے خیر خواہ تھے، جو کچھ قریش کے بس میں تھا حضور پاکؐ سے دشمنی میں انجام دیا، محمدؐ و آل محمد اور ان کے دیگر قریبی رشتہ داروں کے ساتھ مکمل سوشل بائیکاٹ کیا، ان پر ہر طرح کی سختیاں روا رکھیں حتیٰ کہ دانہ پانی تک ان پر بند کر دیا، بنی ہاشم کے ہر زن و مرد اور خورد و کلاں کو تین سال تک شعب ابی طالب میں محصور رکھا، صرف گالم گلوچ، ایذا رسانی اور بد گوئی پر ہی اکتفا کیا، آپؐ کے قتل تک بھی جا پہنچے، آخر کار آپ ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے، پھر بھی ان لوگوں نے دشمنی سے ہاتھ نہ اٹھایا بلکہ اسلام کے بدترین دشمن بھی بن گئے، کئی مرتبہ مدینہ منورہ پر حملہ بھی کیا، حضور ﷺ کے یار و انصار کو شہید کیا، آپ کے چچا (جناب حمزہؓ) کے جسد اطہر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے، ان کا جگر نکال کر چبایا، شہداء کے کانوں اور ناکوں کے ہار بنا کر گلے میں ڈالے، آپؐ کے چچا زاد کو قتل کیا اور کسی قسم کی دشمنی سے دریغ نہیں کیا، خود آنحضرتؐ کو قتل کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔

اس کے برعکس فتح مکہ کے موقع پر جبکہ کفر و شرک اور بت پرستی کے اس مرکز نے اسلامی لشکر کے ہاتھوں سقوط کیا اور قریش ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے، تو حضور گرامی قدر ﷺ کی طرف سے منادی نے ندا دی "آج مہر و محبت

اور رحمت کا دن ہے نا کہ جنگ و جدال اور انتقام لینے کا!" حضورﷺ نے سب کو آزاد قرار دے دیا کسی پر مقدمہ نہیں چلایا، اپنے چچا کے قاتل تک کو معاف کر دیا، جس عورت نے آپ کے چچا مظلوم کا پیٹ چاک کر کے ان کا جگر باہر نکالا اور چبایا تھا، شہداء کے اعضاء سے گلے کے ہار بنائے، اسے بھی معاف کر دیا لشکر کفر کے سرغنہ ابوسفیان کے گھر تک کو دارالامان قرار دیا، زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ تین سو اونٹ اسے اور اس کی اولاد کو عطا فرمائے حالانکہ اس علاقہ میں اونٹ عربوں کا نہایت ہی قیمتی سرمایہ شمار ہوتا تھا۔

یہ تھی حضرت محمدﷺ کی حکومت اور دشمنوں کے ساتھ ان کا برتاؤ، جبکہ ان پر فتح حاصل کر چکے، حالانکہ آپ سب کچھ کر سکتے تھے اور کوئی طاقت آپ کو روکنے والی بھی نہیں تھی۔

ایک خواب

شیخ نصراللہ نے ایک رات حضرت علی علیہ السلام کو خواب میں دیکھا اور عرض کیا: یاامیر المومنینؑ! آپ لوگوں نے شہر مکہ کو فتح کیا تو یہ اعلان کر دیا! "جو شخص ابوسفیان کے گھر پناہ لے گا اسے امان مل جائے گی" جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان لوگوں نے آپ کے فرزند ارجمند حسین علیہ السلام اور ان کے یار و انصار کو شہید کر دیا!؟

تو آپ عَلَیْہِ السَّلَام نے اسے جواب دیا "مجھ سے کیا پوچھتے ہو، جاؤ اور اس بارے میں "حیص و بیص" کے شاعر سے پوچھو:"

شیخ نصر اللہ نیند سے بیدار ہوئے اور سیدھے شاعر کے دروازے پر پہنچے اور اس سے اپنا خواب بیان کیا، یہ سن کر شاعر نے رونا شروع کر دیا اور قسم کھا کر کہا "میں نے یہ شعر اسی رات کہے ہیں اور اب تک اس بات سے کوئی بھی واقف نہیں ہے، کیونکہ نہ تو انہیں میں نے کسی کے سامنے پڑھا ہے، اور نہ ہی اپنی تحریر کسی کو دکھائی ہے اور وہ شعر یہ ہیں:

مَلَکنَا فَکَانَ العَفوُ مِنَّا سَجِیَّۃً　　فَلَمَّا مَلَکتُم سَالَ بِالدَّمِ اَبطَح

وَحَلَّلتُمُوا قَتلَ الاُسَارٰی فَطَالَمَا　　نَمُرُّ عَلَی الاَسرٰی فَنَعفُوا وَ نَصفَح

فَحَسبُکُمُوا ھٰذَا التَّفَاوُت بَینَنَا　　فَکُلُّ اِنَاءٍ بِالَّذِی فِیہِ یَنضَح

یعنی "جب ہماری حکومت تھی تو ہم نے اپنی عادت کے مطابق معاف کرتے رہے لیکن جب تمہاری حکومت آئی تو سرزمین بطحا میں خون کی نہریں بہنے لگیں۔

تم لوگوں نے تو قیدیوں کے قتل کو حلال جانا، لیکن جب ہم قیدیوں کے پاس سے گزرتے تھے تو انہیں معاف کر دیتے اور درگزر سے کام لیتے تھے۔

پس یہی فرق ہے ہمارے اور تمہارے درمیان، کیونکہ جو کچھ برتن میں ہوتا ہے وہی اس سے ٹپکتا ہے۔

حضرت علی عَلَیہِ السَّلام کا دشمنوں کے ساتھ رویہ

حضرت علی عَلَیہِ السَّلام کا دشمنوں کے ساتھ رویہ انسان دوستی کا شاہکار ہے کسی سے اس کی مثال نہ دیکھی گئی اور نہ سنی گئی ہے۔جب آپؑ خلافت پر مسند نشین ہوئے اور حکومت کا انتظام سنبھالا تو آپ کے خلاف دشمنوں نے ہر طرف سے سر نکالنا شروع کر دیا۔

جمل والوں کے ساتھ سلوک

بصرہ کی فوج کے سربراہوں نے جنگ جمل کا آغاز کر دیا، بصرہ کے بیت المال کے محافظوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور بیت المال لوٹ لیا، لیکن علی عَلَیہِ السَّلام نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ یہی کہ آپ نے ان لوگوں کے ساتھ مذاکرات کے لیے کچھ لوگوں کو بھیجا، لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا، پھر خود آپ ان کے پاس تشریف لے گئے انہیں ہر طرح سے سمجھایا بجھایا لیکن نتیجہ ڈھاک وہی تین پات، اوران لوگوں نے جنگ اور خون ریزی سے ہاتھ نہیں اٹھایا آخر کار زبردست شکست سے دوچار ہوئے، شکست خوردہ لوگوں کو آپؑ نے معاف کر دیا، اور ان کی کارستانیوں سے درگزر فرمایا، جنگ کی آگ بھڑکانے والے زبیر کے بیٹے اور طلحہ کے فرزند کو بھی معاف کر دیا، اور اس کے دوسرے ساتھی بصرہ کے ایک گھر میں جا چھپے اور جب حضرت علی عَلَیہِ السَّلام کا اس گھر کے پاس سے گزر ہوا اور

اس گھر میں موجود لوگوں کے بارے میں آپ کو بتایا بھی گیا لیکن آپ نے سب سے آنکھیں بند کر لیں اور آگے کو گزر گئے۔

میدان جنگ میں اپنے لشکر کے زخم خوردہ افراد کے غیظ و غضب سے بچانے کے لیے ام المومنین بی بی کو بچا کر بڑی محبت اور مکمل احترام کے ساتھ مدینہ روانہ فرمایا۔

ایک تاریخی واقعہ

عرب کا نامی گرامی پہلوان جس کا نام "عمرو بن معدیکرب" تھا حضور پاک ﷺ کی خدمت میں شرفیاب ہو کر مشرف بہ اسلام ہوا، جب اپنی قوم کی طرف لوٹ رہا تھا تو اپنے باپ کے قاتل کو دیکھ لیا اور اسے پکڑ کر حضور کی خدمت میں لے آیا، اور قصاص کا تقاضا کیا، حضور انور ﷺ نے فرمایا جو خون زمانہ جاہلیت میں بہایا گیا ہے اسلام میں اس کا قصاص نہیں ہے، یہ سن کر عمرو غصے میں مرتد ہو گیا، اور اپنے وطن واپس چلا گیا اور وہاں جا کر ایک مسلمان قبیلے کی لوٹ مار شروع کر دی۔

حضورؐ نے اس کے تعاقب میں حضرت علی علیہ السلام کو بھیجا، جب یہ خبر عمرو کو ملی تو وہ آپؑ سے لڑنے کے لئے تیار ہو گیا، اور میدان میں آکر مدمقابل کو چیلنج کیا، حضرت علی علیہ السلام بذات خود میدان میں اترے، اب میدان میں اسلام کا پہلوان اور عرب کا پہلوان آمنے سامنے ہوئے، حضرت علی علیہ السلام نے اس کے

سامنے تلوار نیام سے نہیں نکالی بلکہ ایک پہلوانی گُر سے اسے میدان سے باہر کر دیا اور وہ یوں کہ جب عمرو میدان میں آیا تو امام عَلَیہِ السَّلَام نے ایک نہایت ہی گرجدار آواز کے ساتھ اسے للکارا جس سے اس کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا،

حالانکہ یہ وہ شخص تھا جو کہا کرتا تھا کہ میں کسی سے نہیں ڈرتا، لیکن علی عَلَیہِ السَّلَام کی گرجدار آواز سن کر میدان سے بھاگ گیا اور علی عَلَیہِ السَّلَام خون بہائے بغیر فاتح قرار پائے۔

یہ بھی مولا علی عَلَیہِ السَّلَام کے عظیم شاہکاروں میں سے ایک شاہکار ہے۔ کچھ عرصے بعد یہی عمرو پشیمان ہوا اور دوبارہ اسلام لے آیا اور اس کا اسلام قبول کر لیا گیا۔

مرتد اور غارتگر دشمن کے ساتھ علی عَلَیہِ السَّلَام کے مشفقانہ سلوک نے اسے موت اور ہلاکت سے بچا لیا، جبکہ وہ اسے قتل کر سکتے تھے لیکن نہیں کیا، دشمن کو نیست و نابود کر سکتے تھے لیکن نہیں کیا، اور دشمن بھی ایسا کہ جس نے اسلام کے خلاف تلوار کھینچ لی تھی اور مسلمانوں کی لوٹ مار کی تھی۔

(الارشاد جلد ا ص ۱۵۷ تا ۱۶۰ معدیکرب کے تفصیلی حالات کے لئے ابن کثیر اور اسد الغابہ جلد ۳ ص ۱۳۲ تا ۱۳۴ کا مطالعہ فرمائیں)

یمن کی ماموریت

یمن ایک عربی ملک تھا اور ہے، تمدن کے لحاظ سے حجاز سے زیادہ پیش رفتہ ملک تھا، لیکن اہل یمن میں سے کوئی بھی شخص ابھی تک مسلمان نہیں ہوا تھا، حضور سرور کائنات ﷺ نے یمن میں تبلیغ کے لئے علی علیہ السلام کو مامور فرمایا۔

آپ علیہ السلام کی لیاقت، مہربانی، شائستگی، شفقت اور رحم دلی اس بات کا سبب بنی کہ پورا ملک بغیر کسی جنگ و جدال اور خون ریزی کے مسلمان ہو گیا، سب سے پہلے قبیلہ ہمدان مسلمان ہوا پھر دوسرے قبائل،

اس سفر میں حضرت علی علیہ السلام نے کیا کیا؟ بد بختی اس بات میں ہے کہ تاریخ اس کی تفصیل کے بارے میں خاموش ہے ورنہ آپ کا یہ کردار بھی تبلیغ کرنے والوں کے لئے عظیم مشعل راہ ہوتا۔

یہ اسلام کے لئے بھی اور حضرت علی علیہ السلام کے لئے بھی اعزاز کی بات ہے کہ ایک پورا ملک صرف آپؑ کی تبلیغ کی وجہ سے مسلمان ہو جاتا ہے اور تلوار چلانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ یمن والوں کے دل صاف تھے، انہیں منطقی گفتگو کی ضرورت تھی اور وہ ان کے کام آگئی۔

یہ ہے علی علیہ السلام کا راستہ اور یمن کے بعد کئی اور بھی ممالک تھے جو کسی جنگ اور خون ریزی کے بغیر اسلام سے وابستہ ہو گئے، مثال کے طور پر انڈونیشیا انہیں ممالک میں سے ہے، ملائیشیا انہیں ملکوں میں سے ہے، سیلون، بنگال اور

کشمیر جنت نظیر ملک بھی ایسے ممالک میں شامل ہیں، بر اعظم افریقہ کے کئی ملک ایسے ہی ملکوں میں سے ہیں، لعنت ہے ایسی زبانوں پر اور ایسی تحریروں پر جو کہتی ہیں کہ "اسلام بزور شمشیر پھیلا"

اسلام میں تلوار اس وقت اٹھائی گئی جب اسے اُپی ہوئی تلواروں کا سامنا کرنا پڑا، اور واضح سی بات ہے کہ پھر اینٹ کا جواب پتھر ہی سے دینا پڑتا ہے اور تلوار کا جواب تلوار ہی ہو سکتا ہے۔

اگر حضور ختمی مرتبت محمد مصطفیٰ ﷺ کی رحلت کے بعد زمام حکومت ولی خدا علی بن ابی طالب علیہ السلام کے ہاتھوں میں ہوتی تو کبھی تلوار اٹھانے کی نوبت ہی پیش نہ آتی، کسی کو قتل نہ کیا جاتا، اور اسلامی حکومت ایک عظیم عرب مملکت میں تبدیل ہو جاتی، یہ دنیا ہی کچھ اور ہوتی، لیکن افسوس کہ علی علیہ السلام کے راستے کو اختیار ہی نہیں کیا گیا کیونکہ علی کا راستہ محمد مصطفیٰ کا راستہ تھا اور محمد مصطفی ﷺ خدا کا راستہ تھا اور محمد مصطفیٰ ﷺ رحمت للعالمین تھے اور اللہ ارحم الراحمین ہے علی علیہ السلام کا راستہ جنگ و جدال اور قتل و غارت سے پاک صاف راستہ ہے، بلکہ ان سے بیزاری کا راستہ ہے۔

جنگ جمل میں علی علیہ السلام کا کردار

حضرت علی علیہ السلام کی حکومت کے دور میں تین جنگیں ہوئیں، جمل، صفین اور نہروان، ان تینوں جنگوں میں علی کا کیا کردار تھا؟ آپؑ نے ان

جنگوں میں تا حد امکان کوشش کی کہ جنگ کی نوبت نہ آئے اور کسی ایک شخص کا بھی خون نہ بہے، جب مدینہ میں آپؑ کو اطلاع ملی کہ جمل کی فوج کے سربراہوں نے بصرہ کی طرف جانے کے لئے مکہ معظمہ کو چھوڑ دیا ہے تو آپ فوراًان کے ساتھ مذاکرات کے لئے مدینہ سے بصرہ کی طرف روانہ ہو گئے، بصرہ کی بزرگ شخصیت جناب صعصہ بن صوحان کے ذریعہ ان لوگوں کو خط روانہ کیا جس میں ان کو وعظ و نصیحت کی گئی تھی اور جنگ سے باز رہنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔(شیخ مفید کی کتاب الجمل ص ۳۱۴،۳۱۳)

دوسری بار ابن عباس کو زبیر کے پاس بھیجا تا کہ وہ ان سے اس بارے میں بات چیت کریں، البتہ ابن عباس سے یہ بھی فرمایا کہ: طلحہ کے پاس نہ جانا اور اس سے کوئی بات نہیں کرنی کیونکہ اس سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ لیکن زبیر سے ضرور بات کرنا اس میں کچھ نرمی پائی جاتی ہے اس سے کہنا کہ آپ کے ماموں زاد کہتے ہیں کہ "حجاز میں تو آپ میرے دوست تھے لیکن عراق میں میرے دشمن بن گئے ہو، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟(الجمل ص ۳۱۸،۳۱۷)

ساتھ ہی آپ نے ایک اور خط طلحہ اور زبیر کی طرف بصرہ کی نہر بنانے والے شخص کہ جس کا نام عمران خزاعی تھا کے ہاتھوں روانہ کیا، جس میں تحریر فرمایا کہ: تم لوگ بات کو جتنا چھپاؤ لیکن یہ تو جانتے ہو کہ حصول خلافت کے لئے میں کبھی لوگوں کے پاس نہیں گیا بلکہ یہ لوگ ہی تھے جو بیعت کے لئے میرے پاس آئے، انہوں نے خود ہی میرے ہاتھ پر بیعت کے لئے ہاتھ بڑھایا، لوگوں

نے کسی دباؤ یا خوف کے مارے میری بیعت نہیں کی اور نہ ہی میں نے کسی کو کوئی لالچ دی اگر تم لوگوں نے بھی میری بیعت کسی خوف اور دباؤ یا طمع و لالچ کے بغیر کی تھی تو تمہیں جلد تر توبہ کرنا چاہیے اور خدا کی طرف لوٹ آنا چاہیے، تم لوگ کہتے ہو کہ عثمان کو میں نے قتل کیا ہے تو میں اس کا معاملہ غیر جانبدار لوگوں کے سپرد کرتا ہوں اور فیصلہ جس کے خلاف آئے اسے ہی جرمانہ ادا کرنا چاہیے، اے قریش کے دو بڑے لوگو! اپنے ان طور طریقوں سے باز آ جاؤ اگرچہ اس کام کو اپنے لئے ایک ننگ و عار تو سمجھو گے لیکن اس بات سے تو بہتر ہے کہ اسے اپنے ساتھ آتش جہنم میں لے جاؤ۔ (مناقب آل ابی طالب جلد ۳ ص ۱۵۲)

حضرت علی عَلَیہِ السَّلام کی مناجات

کتابوں میں ہے کہ جب آپ بصرہ کی طرف جا رہے تھے تو سرزمین "زاویہ" پر پہنچ کر چار رکعت نماز ادا فرمائی اور بارگاہ رب العزت میں یوں مناجات کرنے لگے۔

"اے آسمانوں کے اللہ، اور جن پر یہ آسمان سایہ فگن ہیں، اے زمینوں کے معبود اور جو ان کی دوش پر سوار ہیں، اے عرش عظیم کے مالک اللہ! یہ بصرہ ہے میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ تو اس شہر کے لوگوں کی خیر اور بھلائی میرے ہاتھوں میں قرار دے اور ان لوگوں کے شر سے مجھے بچائے رکھ، بارالٰہا! ان لوگوں نے میری اطاعت سے روگردانی کر لی ہے، مجھ پر سرکشی

کی ہے، میری بیعت کو توڑا ہے، میرے معبود! مسلمانوں کے خون کی حفاظت فرما، اور کسی کا خون نہ بہنے دے"

جب بصرہ والوں کی فوج سے آمنا سامنا ہوا تو انہیں باآواز بلند کہا "لوگو! ٹھہرو!! جلدی نہ کرو!! پھر آپ نے عبداللہ بن عباس کو بلا کر فرمایا: طلحہ، زبیر اور بی بی عائشہ کے پاس پاس جا کر انہیں حق کی دعوت دو۔ (مناقب آل ابی طالب جلد ۳ ص ۱۵۲)

پھر پیغمبر اسلام ﷺ کے بزرگ صحابی راہ حق میں زندگی گزارنے والے عظیم انسان حضرت عمار یاسرؓ دونوں لشکروں کے درمیان جا کھڑے ہو گئے اور بصرہ والوں کی فوج سے مخاطب ہو کر فرمایا: لوگو!" تم نے انصاف سے کام نہیں لیا، اپنی بیویوں کو تو پردوں میں بٹھا رکھا ہے اور حضرت رسول خدا ﷺ کی زوجہ محترمہ کو تیروں اور تلواروں کے سامنے لے آئے ہو!"

اس کے بعد وہ ام المومنین کے پاس چلے گئے اور ان سے پوچھا کہ آپ کیا چاہتی ہیں؟ اس نے کہا "میں عثمان کے خون کا بدلہ لینے آئی ہوں"

عمار نے کہا: "خدا آج کے دن ظالم، سرکش اور باطل کے رستوں پر چلنے والوں کو غارت کرے"

پھر آپ نے بصرہ کے لشکر والوں کی طرف منہ کر کے بلند آواز سے کہا: "لوگو! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم دو گروہوں میں سے کون لوگ عثمان کے

قتل میں شریک تھے؟"(الجمل ۳۳۶، نہج السعادہ محمد باقر محمودی جلد ا ص ۳۰۳تا۳۰۶)

ان کے اس سوال کے بعد تیر برسنے لگے، گویا منطق کا جواب تیر تھے، عمار حضرت امیر المومنین عَلَیہِ السّلام کے پاس واپس آگئے اور عرض کیا:"یا علی عَلَیہِ السّلام !اب آپ کس بات کے انتظار میں ہیں، قتل کے علاوہ ان کا کوئی مقصد نہیں"(الجمل ص ۳۴۰،۳۳۹)

اب علی عَلَیہِ السّلام کے لشکر کی طرف جمل والوں کی طرف سے بارش کی طرح تیر برسنا شروع ہو گئے، پھر بھی آپؑ نے جنگ کی اجازت نہ دی، بلکہ فرمایا:"کون ہے جو اس قرآن کو لے کر ان لوگوں کے پاس جائے اور انہیں قرآن کی طرف بلائے؟ البتہ جو شخص ایسا کرے گا وہ مارا جائے گا اور میں اس کے لئے بہشت کا ضامن ہوں، یہ سن کر "مسلم" نامی ایک تازہ نوجوان کھڑا ہو گیا اور کہا!"یا امیر المومنین عَلَیہِ السّلام! میں اس قرآن کو لے جاؤں گا اور جو کچھ آپؑ نے فرمایا ہے اس پر عمل کروں گا، یہ کہا اور قرآن کو اٹھا کر جمل والوں کے پاس گیا اور انہیں قرآن کی طرف بلانے لگا۔ جواب میں انہوں نے اس کے پیکر پاک کو نیزوں سے چھلنی کر دیا، اور وہ زمین پر گر کر راہی جنت ہوا۔(الجمل ص ۳۴۲)

اسے منطق کا جواب نیزوں سے دیا گیا۔ اب امام عَلَیہِ السّلام نے اپنے لشکر کو جنگ کی تیاری کا حکم دیا او فرمایا کہ جنگ کو ہم نے شروع نہیں کرنا نہ تو تم نے تیر چلانا ہے نہ تلوار اور نہ ہی نیزا!!۔

حضرت امیر عَلَیہِ السَّلام کے لشکر کا ایک رشید اور دلیر جرنیل "ابن بُدیل" میدان سے اپنے مذکورہ فرزند کی میت کو اٹھالایا اور مولا سے عرض کیا" یا امیر المومنین عَلَیہِ السَّلام ہم کب تک صبر کرتے رہیں گے اور یہ لوگ ایک ایک کر کے ہمیں قتل کر رہیں گے اور ہم دیکھتے رہیں گے ؟" اسی اثنا میں ایک اور سپاہی کی میت کو لایا گیا جسے تیر کے ساتھ شہید کیا گیا تھا، پھر بھی آپ عَلَیہِ السَّلام نے جنگ کی اجازت نہ دی، بلکہ اپنی طرف سے بارگاہ رب العزت میں یہ جملہ ادا کیا:" خداوندا! تو گواہ رہنا"(الجمل ص ۳۴۲)

اب لشکر والوں کی طرف مولا نے منہ کر کے کہا" خدا راان لوگوں پر رحم کریں"

زبیر سے مکالمہ

اس کے بعد امام عالی مقام نے اپنے بدن سے اسلحہ اتارا اور رسول خدا صَلَّی اللهُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کے خچر پر سوار ہو کر میدان میں آئے اور بلند آواز سے زبیر کو بلایا اور کہا: ذرا میرے پاس آؤ!" وہ مکمل طور پر مسلح ہو کر آپ عَلَیہِ السَّلام کے پاس پہنچ گیا،

ام المومنینؓ کو جب معلوم ہوا کہ علی عَلَیہِ السَّلام نے زبیر کو میدان جنگ میں بلایا ہے تو کہا" ہائے میری بہن اسماء تو اب بیوہ ہو گئی ہے" کیونکہ زبیر ام المومنینؓ کے بہنوئی تھے۔ لوگوں نے کہا" گھبرائیں نہیں، علی عَلَیہِ السَّلام کے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہے بلکہ زبیر کامل مسلح ہے" تو چپ ہو گئیں۔

مولانے میدان جنگ کے درمیان زبیر کو گلے لگالیا ار پوچھا: یار! تم نے میرے خلاف کیوں خروج کیا ہے؟ اس نے کہا کہ عثمان کے خون کا بدلہ لینے کے لئے 'یہ سن کر امام عَلَیہِ السَّلام نے فرمایا" خداوند عالم دونوں میں سے اسے غارت کرے جس کا عثمان کے قتل میں کسی قسم کا ہاتھ ہو!!"

پھر آپ نے بڑے نرم اور پُر سکون لہجے میں اسے رسول خدا صَلَّی اللهُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کا یہ فرمان یاد دلایا کہ آپؐ نے فرمایا تھا"تو علیؑ کے ساتھ جنگ کرے گا اور ظالم تو ہی ہو گا"زبیر نے کہا:"میں خدا سے معافی مانگ لوں گا"(مناقب آل ابی طالب جلد ۳ص ۱۵۴)

پھر کہا :اگر یہ بات مجھے یاد ہوتی تو میں خروج نہ کرتا "امام نے فرمایا:"اب بھی وقت ہے واپس چلا جا"زبیر نے کہا:"اب میں کیوں کر واپس جا سکتا ہوں لوگ تو مجھے طعنے دیں گے کہ موت سے ڈر کر واپس آگیا ہے"اور یہ ایک ایسا کلنک کا ٹیکہ ہے جو دھلے نہیں دھلے گا،امام نے فرمایا:" قبل اس کے کہ اس ننگ وعار کو اپنے ساتھ جہنم میں لے جاؤ،ابھی میدان سے واپس چلے جاؤ"

زبیر کا ارادہ بدل گیا اور میدان جنگ سے واپس جانے لگا تو اس کے بیٹے عبد اللہ نے بلند آواز سے کہا کہ "بابا آپ کہاں جا رہے ہیں؟"زبیر نے کہا"بیٹے!ابوالحسن نے مجھے وہ بات یاد دلا دی جسے میں فراموش کر چکا تھا"عبد اللہ نے کہا: بابا ایسی کوئی بات نہیں آپ بنی ہاشم کی تلواروں سے ڈرتے ہیں!!باپ نے کہا: بیٹے!جو بات زمانے نے مجھے بھلا دی تھی وہ علی عَلَیہِ السَّلام نے مجھے یاد دلا دی ہے، تم

مجھے خوف کا طعنہ دے رہے ہو، یہ کہا اور ہاتھ میں نیزہ لے کر علی علیہ السلام کے میمنہ پر حملہ کر دیا۔

مولا علیؑ نے اپنے لشکر والوں سے کہا: اس پر کوئی شخص حملہ نہ کرے، اس کے لئے راستے کھول دو تا کہ یہ باہر نکل جائے، کیونکہ اسے اکسایا گیا ہے۔

زبیر نے میمنہ کے بعد میسرہ پر حملہ کیا اور اپنے بیٹے سے کہا: ڈرپوک لوگ ایسا کرتے ہیں کیا؟ پھر وہ لشکر سے نکل کر باہر چلا گیا((مناقب آل ابی طالب جلد ۳ ص ۱۵۴)

دشمن کے ساتھ علی علیہ السلام کی مہربانی کا یہ عالم تھا کہ اسے میدان جنگ کے ایک بہادر شخص کا اعزاز فرمایا، آیا جمل کی فوج یہ بات سمجھتی تھی کہ علی علیہ السلام کے بارے میں زبیر سے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان صرف اسی کے ساتھ مخصوص نہیں تھا، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک معیار مقرر کر دیا تھا جو بھی علی علیہ السلام کے ساتھ جنگ کرے گا وہ ظالم ہو گا۔

طلحہ سے ہم کلامی

پھر آپ علیہ السلام میدان جنگ میں آئے اور طلحہ کو بلا کر پوچھا: "تم نے میرے خلاف کیوں خروج کیا؟" اس نے کہا کہ خون عثمان کا بدلہ لینے کے لئے!"

آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ ہم دونوں میں سے اسے غارت کرے جو عثمان کے قتل میں شریک ہو، آیا تم نے حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ

فرمان نہیں سنا تھا کہ : یا اللہ ! جو علیؑ کا دوست بنے تو بھی اسے دوست رکھ اور جو علیؑ کا دشمن بنے تو بھی اس سے دشمنی فرما"

طلحہ ! تم وہی شخص نہیں ہو جس نے سب سے پہلے میری بیعت کی تھی؟ اور پھر خود ہی توڑ دی ہے جبکہ خداوند عالم فرماتا ہے" فَمَن نَّكَثَ فَإِنَّمَا يَنكُثُ عَلَىٰ نَفْسِهِ "(فتح ۱۰) یعنی" جو عہد شکنی کرتا ہے وہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے" یہ سن کر طلحہ پشیمان ہو گیا اور کہنے لگا: میں خدا سے معافی مانگتا ہوں" اور واپس چلا گیا۔

فوجیوں کو ہدایت

اب امام عَلَيْهِ السَّلَام نے اپنے لشکر کو ہدایات دیتے ہوئے فرمایا؛

"جب تم نے دشمن کو شکست دے دی تو پھر کسی زخمی کو قتل نہیں کرنا، قیدیوں کو موت کے گھاٹ نہیں اتارنا، کسی بھاگنے والے کا تعاقب نہیں کرنا، کسی کو برہنہ نہیں کرنا، کسی مقتول کا مثلہ (ٹکڑے ٹکڑے) نہیں کرنا، ہاتھ، کان یا ناک کو جسم سے جدا نہیں کرنا، کسی کا مال نہیں لوٹنا، سوائے اس کے کہ جو مال وہ میدان جنگ میں چھوڑ جائیں (الجمل ص ۳۴۲)

امام عَلَيْهِ السَّلَام کی نگاہ میں دشمن کی شکست حتمی تھی لیکن پھر بھی حملے کا حکم صادر نہیں فرمایا۔

ادھر جمل والوں نے امام عَلَيْهِ السَّلَام کے لشکر کے میمنہ پر حملہ کر دیا اور اسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا، اس پر امام عَلَيْهِ السَّلَام نے دشمن پر حملے کا حکم صادر فرمایا اور

جمل والوں کے لشکر سے جان چھوٹ گئی (مزید تفصیلات کے لئے شیخ مفید کی کتاب "الجمل والنصرۃ لسید العترۃ فی حرب البصرۃ)

ملاحظہ فرمایا آپ نے میدان جنگ میں انسانوں پر علیؑ کی شفقت، مرحمت اور مہربانی، آیا تاریخ انسانیت میں کہیں ملتا ہے کہ کسی مقتدر حاکم نے اپنی حکومت کے فرعون صفت سرکشوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا ہو؟
جمل والوں کے ساتھ مولا کے سلوک کے بعد اب ہم معاویہ کے ساتھ آپ عَلَیہِ السَّلام کے سلوک کا ذکر کرتے ہیں۔

معاویہ کے ساتھ آپ عَلَیہِ السَّلام کا رویہ

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ان خطوط کا جائزہ لیں جو امیر المومنین علی عَلَیہِ السَّلام اور معاویہ نے ایک دوسرے کو لکھے تھے اور حضرت امیر عَلَیہِ السَّلام نے معاویہ کو راہ راست پر لانے اور جنگ سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی، تو اس کے لئے ہمیں الگ سے ایک کتاب لکھنے کی ضرورت پڑے گی، ہم یہاں پر صرف معاویہ کے ساتھ آپ عَلَیہِ السَّلام کے نرم رویہ کا ذکر کریں گے۔

صفین کا مقام دریائے فرات کے کنارے واقع ہے جب آپ عَلَیہِ السَّلام کا لشکر مقام صفین پر پہنچا تو آپ سے یہ درخواست کی گئی کہ معاویہ کے لشکر پر دریا کا پانی بند کر دیا جائے تو آپ نے درخواست کو منظور نہیں فرمایا اور پانی کو کھلا رہنے دیا۔

مگر جب معاویہ کو دریا پر قبضے کا موقع ملا تو اس نے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے علی عَلَیہِ السَّلام کے لشکر پر پانی بند کر دیا مگر حضرت کے حکم سے اس قبضے کو چھڑا لیا گیا۔

دوستوں نے چاہا کہ دشمن کے ساتھ اسی طرح کا سلوک کرتے ہوئے ان پر بھی پانی بند کر دیا جائے، پھر بھی مولا نے انہیں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی، اور آخری دم تک پانی ان کے لئے کھلا رکھا۔(الصفین، نصر ابن مزاحم ۱۵۷-۱۶۷-۱۸۴-۱۸۲-۱۹۳)

جنگ صفین اٹھارہ مہینوں تک جاری رہی ایک لمبے عرصے تک آپ کی طرف سے عمومی حملے کا حکم نہیں دیا گیا، شاید شامی باز آجائیں، شاید پشیمان ہو جائیں، شاید راہ راست پر آجائیں، شاید ہدایت پا جائیں، اس طرح سے کم سے کم خون بہایا جا سکے (مزید تفصیل کے لئے اسی کتاب کا مطالعہ کیا جائے جو صفین کے بارے میں اہم ترین کتاب ہے)

خوارج کے ساتھ سلوک

اب آتے ہیں اس طرف کہ خوارج کے ساتھ آپ عَلَیہِ السَّلام نے کیا سلوک روا رکھا؟ تو اس بارے میں بہترین تعبیر جو ہم بیان کر سکتے ہیں وہ یہ کہ یہ لوگ علی عَلَیہِ السَّلام سے دشمنی کی بیماری میں مبتلا تھے، جب تک انہوں نے علی عَلَیہِ السَّلام کو شہید نہیں کر لیا آپ کی دشمنی سے باز نہیں آئے۔

ہم نے "بیماری" کا لفظ کا استعمال اس لئے کیا ہے کیونکہ کسی کے ساتھ دشمنی کا کوئی سبب ہوتا ہے یا کوئی ذاتی جھگڑا ہوتا ہے، جاہ وجلال یا مقام م منصب کی لالچ ہوتی ہے، کسی سے کوئی نقصان اٹھایا ہوتا ہے، کسی کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوں گے، کوئی خاندانی دشمنی ہوتی ہے، کسی سے کوئی مذہبی جھگڑا ہوتا ہے، لیکن علی عَلَیہِ السّلام کے ساتھ ان کی دشمنی کا مذکورہ اسباب میں سے کوئی ایک سبب بھی نہیں تھا، وہ صرف اس بنا پر آپ عَلَیہِ السّلام کے دشمن تھے کہ آپ کو زندہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے، ان کی حکومت عدل کو نہیں دیکھنا چاہتے تھے، علی عَلَیہِ السّلام کی کامیابی کو نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔

خوارج جنگ صفین میں علی عَلَیہِ السّلام کے جنگجو سپاہی تھے لیکن عین کامیابی کے موقع پر آپ کے سامنے تلواریں نکال لیں اور جیتی ہوئی جنگ کا پانسہ پلٹ دیا، تحکیم کے سلسلے میں حضرت علی عَلَیہِ السّلام نے اپنی طرف سے جس ثالث کا تقرر کیا تھا اسے قبول نہیں کیا لیکن دشمن نے جو ثالث مقرر کیا اسے قبول کر لیا۔

وہ یقینا معاویہ کے بھی دشمن تھے اس کے ساتھ ان کی دشمنی مسلک کی بنا پر تھی لیکن اس کے باوجود انہوں نے ناآگاہی کی بنا پر اس کی مدد کی، انہوں نے حضرت امیر عَلَیہِ السّلام کو تحکیم کے لئے دشمن کی طرف سے مقرر کردہ دونوں ثالثوں کا فیصلہ قبول کرنے پر مجبور کر دیا، جس ثالث کو حضرت امیر عَلَیہِ السّلام نے مقرر کیا تھا اسے قبول نہیں کیا لیکن جس کا دشمن نے تقرر کیا اسے کرسی پر بٹھایا۔

جب حضرت امیر علیہ السلام کے ثالث کی خیانت ظاہر ہو گئی تو اس کا ذمہ دار علی علیہ السلام کو ٹھہرایا، آپ کے سامنے اور پس پشت آپ کی توہین کیا کرتے تھے اور خود کو آنجنابؑ کے مؤاخذہ سے محفوظ سمجھتے تھے، امام علیہ السلام نے بھی انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیا تھا اور ان کی ہر طرح کی گستاخی پر کسی قسم کا رد عمل کا کبھی کوئی اظہار نہیں فرمایا۔

آپ علیہ السلام کے دوستوں کے لئے خوارج کی اس قسم کی گستاخیاں ہرگز ناقابل برداشت تھیں، اور ان سے توہین آمیز الفاظ نہیں سنے جاسکتے تھے، لہٰذا انہوں نے آپ علیہ السلام سے درخواست کی کہ یا تو آپ ان کی سرکوبی کریں یا قید میں ڈالیں یا پھر ان کی اس قسم کی آزادی کو محدود فرمائیں، لیکن حضرت نے ان کی کسی بھی بات سے اتفاق نہیں کیا اور صاف صاف کہہ دیا: "جب تک کہ وہ ہم سے کسی قسم کا سروکار نہیں رکھتے تو ہم بھی ان سے کوئی سروکار نہیں رکھیں گے اگر وہ کوئی بات کریں گے تو اس کا جواب دیں گے، بیت المال سے ان کا حصہ بھی نہیں روکیں گے مسجد جو اللہ کا گھر ہے اس میں آنے سے بھی نہیں روکیں گے، اگر جنگ کے لئے آمادہ ہوں گے تو ان کا مقابلہ کریں گے"۔(نہج السعادہ ج ۲ ص ۳۴۸، ۳۳۹، ۳۳۳، ۳۱۱)

خوارج کی اندرونی بیماری میں شدت آگئی تھی اب وہ کوفہ میں نہیں رہنا چاہتے تھے، کیونکہ یہاں پر علی علیہ السلام رہ رہے ہیں، اور چونکہ علی علیہ السلام کو زندہ دیکھ رہے ہوتے ہیں، لہٰذا یہ چیز ان کے لئے ناقابل برداشت ہو گئی تھی، لہٰذا کوفہ کو

چھوڑ کر "نہروان" چلے گئے، پھر بھی حضرت عَلَیہِ السَّلَام نے انہیں آزاد چھوڑ دیا اور ان سے کوئی سروکار نہیں رکھا۔

خوارج کے نام خط

جب امام عَلَیہِ السَّلَام معاویہ کی سرکوبی کے روانہ ہونے لگے تو خوارج کے نام یہ خط تحریر فرمایا:

"تم لوگ بھی ہمارے ساتھ چلو، ہم تمہارے دشمن کی سرکوبی کے لئے جارہے ہیں جو ہمارا اور تمہارا مشترکہ دشمن ہے" (نہج السعادہ ص۳۶۸،۳۵۷)

لیکن خوارج نے آپ عَلَیہِ السَّلَام کی یہ پیشکش بھی ٹھکرادی اور خود آپؑ ہی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا، پھر بھی آپؑ ان کا تعاقب کرنے کی بجائے شام روانہ ہو گئے۔

آپ سے کہا گیا کہ بہتر ہے کہ پہلے خوارج کا کام تمام کر دیا جائے پھر شام کی طرف جایا جائے مگر آپ نے اس پیشکش کو قبول نہیں فرمایا اور شام روانہ ہو گئے (نہج السعادہ ص۳۶۳)

آپ کا لشکر آپ کے ساتھ روانہ ہو گیا لیکن راستے میں آپ کو خبر ملی کہ "خوارج نے لوٹ مار شروع کر دی ہے اور لوگوں کو آپ پر ناروا الفاظ کہنے پر مجبور کر رہے ہیں اور جو ان کی بات نہیں مانتا اسے قتل کر دیا جاتا ہے"

اس خبر کے سنتے ہیں آپ "نہروان" کی طرف روانہ ہو گئے جو خوارج کا مرکز بن چکا تھا، لیکن وہاں پر پہنچتے ہی آپ نے ان سے جنگ شروع نہیں کر دی، بلکہ انہیں وعظ و نصیحت فرمائی، سیدھا راستہ اختیار کرنے کی ہدایت کی، پوری کوشش کی کہ انہیں جنگ سے باز رکھیں، کافی موعظہ فرمایا، بہت سے لوگوں کو جنگ سے باز رکھنے پر کامیاب بھی ہو گئے، لیکن دوسرے لوگوں نے آپ کی ایک نہ مانی، انہوں نے معاویہ کی سرکوبی کے لئے حضرت علی کا ساتھ نہیں دیا گویا وہ معاویہ کا "پانچواں کالم" تھے۔

جو خوارج حضرت علی عَلَیہِ السَّلام سے جنگ کرنے سے باز آ گئے تھے وہ کوفہ کی طرف چلے گئے لیکن علی عَلَیہِ السَّلام کی دشمنی سے باز نہ آئے، اور تاریخ اسلام میں خوارج کا بیج انہی لوگوں کے ہاتھوں بویا گیا،

باقی لوگوں نے جنگ کا راستہ اختیار کیا اور علی عَلَیہِ السَّلام کے ساتھ زندہ رہنے پر موت کو ترجیح دی اور "الرواح، الرواح الی الجنة" یعنی "جلدی چلو، جلدی چلو جنت کی طرف" کہہ کر امام کے لشکر پر حملہ کر دیا۔

لیکن اس کے مقابلے کے لئے پھر بھی حضرت امام عَلَیہِ السَّلام نے حملے کا حکم صادر نہیں فرمایا، جب تک آنجنابؑ کے لشکر سے کوئی سپاہی مارا نہیں گیا، اس پر آپ نے فرمایا: "اب ان لوگوں کے ساتھ جنگ روا ہے" (نہج السعادہ ج ۲ ص ۳۹۴، ۳۸۸)

چنانچہ آپ کے فرمان کے مطابق لشکر نے ان پر ایسا حملہ کیا کہ جس سے وہ تباہ ہو گئے،جی ہاں جناب! علی عَلَیہِ السَّلام کا داخلی دشمن کے ساتھ یہ سلوک تھا اور یہ تھا علی عَلَیہِ السَّلام کا راستہ جو حضرت محمد صَلَّی اللهُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کا راستہ ہے اور رسول خدا کا راستہ خدا کا راستہ ہے۔

اسلامی حکومت میں ریاست کے جو مخالفین، اسلام کے زیر سایہ رہ رہے ہوتے ہیں ان کے ساتھ ایک خصوصی رعایت برتی جاتی ہے اور وہ یہ کہ کچھ رقم دے کر ان کے دلوں کو اپنی طرف مائل کیا جاتا ہے جنہیں اصطلاح میں "مؤلفة القلوب" کہا جاتا ہے اور زکوٰۃ کے آٹھ مصارف میں سے ایک مصرف یہی "مؤلفة القلوب "ہیں،شاید اسی وجہ سے ہے اور "مؤلفة القلوب" وہ لوگ ہوتے ہیں جو ظاہر میں تو اسلام لے آتے ہیں لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ باطن میں بھی مسلمان ہوئے ہیں یا اپنے کفر پر ابھی باقی ہیں اور اسلامی حکومت کے ابھی تک مخالف ہیں؟

حضرت امیر المومنین عَلَیہِ السَّلام کی زرہ گم ہو گئی تھی اور ایک عیسائی کے پاس سے ملی آپؑ نے قاضی کے پاس جا کر کہا:"یہ زرہ میری ہے اور میں نے اسے نہ تو کسی سے بیچا ہے اور نہ ہی کسی کو ہبہ کیا ہے"

قاضی(جج) نے اس عیسائی کی طرف منہ کر کے کہا "خلیفہ کے دعوے کے جواب میں آپ کیا کہتے ہیں؟اس نے کہا:"زرہ میری ہے اس لئے کہ میرے ہاتھ (قبضے) میں ہے البتہ خلیفہ وقت کو بھی نہیں جھٹلا سکتا،ہو سکتا ہے کہ

انہیں غلط فہمی ہوئی ہو، قاضی نے آپؑ سے کہا:" چونکہ آپؑ مدعی ہیں اور مدعی کا فرض ہے کہ وہ گواہ لائے، آیا آپ کے پاس کوئی گواہ ہے؟" حضرت نے فرمایا:" نہیں میرے پاس گواہ تو نہیں ہیں،" جس سے قاضی نے عیسائی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

عیسائی وہ زرہ لے گیا اور ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ لرزہ براندام ہو گیا اور ہنسنے لگا، قاضی کے پاس آ کر کہنے لگا" یہ عام انسانی حکومت نہیں ہے بلکہ یہ انبیاء کی حکومت ہے، یہ زرہ خلیفہ کی ہے، میری نہیں ہے؛ یہ کہہ کر وہ مسلمان ہو گیا اور مولا علی عَلَیہِ السَّلام کے دوستوں میں سے ہو گیا، اور لوگوں نے اسے دیکھا کہ یہی وہ شخص ہے جس نے جنگ نہروان کے موقع پر امام علی عَلَیہِ السَّلام کے ہمرکاب ہو کر جام شہادت نوش کیا۔(بحارالانوار جلد ۴۱ص ۵۷،۵۶ منقول از مناقب آل ابی طالب)

ڈاکٹر طہ حسین مصری جو دنیائے عرب کے بہترین رائٹر ہیں اپنی کتاب "علی وبنوہ" صفحہ ۱۹ میں لکھتے ہیں:

حضرت علی عَلَیہِ السَّلام کی بیعت کے موقع پر جن لوگوں نے آپ عَلَیہِ السَّلام کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا آپ نے انہیں بیعت کرنے پر مجبور نہیں کیا اور نہ ہی اپنے انقلابی لوگوں سے کہا کہ انہیں بیعت پر مجبور کریں۔

بیعت کے بارے میں اس طرح کی آزادی صرف علوی حکومت کا خاصہ تھی، تاریخ خلفاء اسلام میں نہ تو علی عَلَیہِ السَّلام سے پہلے کے خلفاء میں اس کی نظیر پیش

کر سکی ہے اور نہ ہی آپ کے بعد کے خلفاء میں۔ علی عَلَیہِ السَّلام سے پہلے خلفاء کی بیعت اس طرح تھی نہ ہی بعد کے خلفا کی،

ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری اپنی اسی کتاب میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں "حضرت علی عَلَیہِ السَّلام نے لوگوں کو دو کاموں کے بارے میں مجبور نہیں کیا،

ا۔ اپنی حکومت کے ماتحت رہنے پر

۲۔ جنگ میں شرکت کرنے پر

ا۔ حجاز اور عراق کے بہت سے لوگ ایسے تھے جو آپ کی قلمرو حکومت سے نکل کر معاویہ کے ساتھ جا ملے تھے، دین کو چھوڑ کر دنیا کو اختیار کر لیا، لیکن مولا علی عَلَیہِ السَّلام نے ان سے کوئی سروکار نہ رکھا اور نہ انہیں شام جانے سے روکا۔

۲۔ جنگ میں شرکت کے لئے آپ نے کسی کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور نہیں کیا، ہر ایک کو اس کی مرضی پر چھوڑ دیا چاہے کوئی ساتھ چلے یا نہ چلے۔

آپ عَلَیہِ السَّلام کا نظریہ یہ تھا کہ ناکثین (جمل والے) قاسطین (صفین والے) اور مارقین (نہروان والے خوارج) کے ساتھ جنگ جہاں آپ کا فریضہ ہے وہاں دوسرے مسلمانوں کا فریضہ بھی ہے، اور یہ جنگیں بھی کفار و مشرکین کے ساتھ جہاد کی حیثیت رکھتی ہیں، لیکن جنگ کسی پر واجب قرار نہیں دی، کسی کو زبردستی میدان جنگ میں نہیں لے گئے، دھونس کا نظام رائج نہیں کیا، زبردستی کسی پر لاگو نہیں کی، آپ جہاد کی دعوت ضرور دیتے، جو آپ کی

دعوت پر لبیک کہتا اس سے خوش ہو جاتے اور جو جواب نہیں دیتا تھا اسے موعظہ و نصیحت فرماتے (علی و بنوہ، ڈاکٹر طہ حسین مصری ص۱۴۹،۱۴۸)

کتاب کافی کلینی میں ہے کہ ایک شخص حضرت علی کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یا امیر المومنینؑ! میں گناہ گار ہوں گناہوں سے بہت آلودہ ہوں، آپ مجھے پاک فرمایئے اور ساتھ ہی اپنے گناہ "اغلام" کا اقرار بھی کیا۔ آپ عَلَیہِ السَّلام نے فرمایا: "اے شخص! یہاں سے چلے جاؤ، شاید یہ تمہارا وہم و خیال ہو" وہ شخص پھر دوسرے دن آگیا اور کل کی طرح عرض گزار ہوا اور اپنے گناہ کا پھر اقرار کیا، حضرت نے وہی جواب دیا، اور تیسرے دن پھر آگیا اور اپنے گناہ کا تیسری مرتبہ اقرار کیا، حضرت نے وہی الفاظ کہہ کر اسے واپس کر دیا،

آخر کار چوتھے دن وہ پھر آیا اور چوتھی مرتبہ اپنے گناہ کا اقرار کیا اور چار مرتبہ کا اقرار حد کے اجراء کے لئے ثابت ہو گیا، تو آپ نے اسے فرمایا اے شخص! حضور پیغمبر صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَآلِہِ وَسَلَّم نے اس گناہ کی سزا کے بارے میں تین حکم صادر فرمائے ہیں تم کسے اختیار کرتے ہو؟ اس نے عرض کیا "مولا! ان میں سے کونسا حکم زیادہ سخت ہے؟ فرمایا: "آگ میں جلانا!" تو اس نے عرض کیا! "یا امیر المومنینؑ! میں اسی سزا کو قبول کرتا ہوں، تو حضرت نے فرمایا: پھر تیار ہو جاؤ!، اس نے کہا: میں تیار ہوں!، یہ کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا، دو رکعت نماز بجالایا پھر ان الفاظ کے ساتھ اپنے اللہ سے راز و نیاز میں مشغول ہو گیا؛ "خداوندا! میں جس گناہ کا مرتکب ہوا ہوں تو بہتر جانتا ہے اور میں اس سے خائف بھی ہوں اور

پشیمان بھی، اور پیغمبر ﷺ کے وصی کے پاس اس لئے آیا ہوں تا کہ وہ مجھے اس گناہ سے پاک کریں ، اور انہوں نے مجھے تین سزاؤں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا فرمایا ہے، تو اے معبود ! میں نے ان میں سے سخت ترین سزا کا انتخاب کیا ہے، تا کہ میرے گناہوں کا کفارہ ہو جائے اور قیامت کے دن جہنم کی آگ سے بچ جاؤں"

یہ کہا اور زار و قطار رونا شروع کر دیا، پھر مصلے سے اٹھا اور اس گڑھے کی طرف چل دیا جو اسے آگ میں جلانے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔

یہ کیفیت دیکھ کر مولا علی عَلَیہِ السَّلام سے بھی گریہ ضبط نہ ہو سکا اور دیگر حاضرین بھی رونے لگ گئے۔

اس وقت اس کا گناہ معاف کر دیا گیا اور حضرت علی عَلَیہِ السَّلام نے فرمایا "اے شخص تو نے تو ملائکہ کو رلا دیا ہے، خدا نے تیری توبہ کو قبول فرمالیا ہے، اٹھ جاؤ اور گھر کی راہ لو، آئندہ ایسا کام نہ کرنا (کافی کلینی جلد ے ص ۲۰۲،۲۰۱)

مولا علی عَلَیہِ السَّلام کی عبادت

عبادت کا معنٰی "بندگی" ہے "بردگی "نہیں ہے،"بندگی" اختیار کے ساتھ ہوتی ہے اور" بردگی "میں "جبر "کا عنصر پایا جاتا ہے بندگی اپنی مرضی کے ساتھ کی جاتی ہے، آزادی کے ساتھ کی جاتی ہے جبکہ بردگی میں دباؤ ہوتا ہے۔

عبادت خدا، بندگی حق کا نام ہے، بندگی لگاؤ کے ساتھ ہوتی ہے، اختیار اور مرضی کے ساتھ بجالائی جاتی ہے، نہج البلاغہ میں حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب عَلَیہِ السَّلام فرماتے ہیں:

کچھ لوگ سزا اور عذاب کے خوف سے اس کی عبادت کرتے ہیں اور یہ غلاموں والی عبادت ہوتی ہے، کچھ لوگ ثواب اور جزاء کی خاطر خدا کی عبادت کرتے ہیں یہ تاجروں والی عبادت ہوتی ہے، اور کچھ لوگ خداوند عالم کے شکر اور سپاسگزاری کی خاطر اس کی عبادت کرتے ہیں یہ آزاد لوگوں کی عبادت ہوتی ہے (نہج البلاغہ حکمت ۲۳۷)

شکر و سپاس گزاری کا پہلے دل میں گزر ہوتا ہے وہیں پر قرار حاصل کرتے ہیں پھر رفتار و گفتار سے نمایاں ہوتے ہیں، پھر معرفت کی نوبت آتی ہے، جب تک معرفت حاصل نہ ہو شکر ادا نہیں کیا جا سکتا، سپاسگزاری نہیں ہو سکتی، معرفت جس قدر تکمیل پذیر ہوتی جائے گی، شکر گزاری اسی قدر بڑھتی جائے گی، معرفت کی وجہ سے امید اور خوف پیدا ہوتے ہیں، جو معرفت نہیں

رکھتا وہ امید اور خوف سے بے بہرہ ہوتا ہے، جو امید و خوف سے بے بہرہ ہوتا ہے وہ شکر گزاری نہیں کر سکتا اور ایسا شخص "بندگی" کے مقدس مقام تک نہیں پہنچ سکتا وہ خدا شناس نہیں ہوتا کہ بندگی کا شکر بجالائے۔

عبادت کی کئی اقسام ہیں اور ان کی بجاآوری کے انداز بھی مختلف ہیں اور مولا علی عَلَیْہِ السَّلَام ان تمام اقسام کو جانتے تھے اور انہی کے طور واطوار کے مطابق بجالاتے تھے۔

خدمت خلق اگر خدا کے لئے ہو تو یہ بھی ایک عبادت ہے، اس کا تعلق صرف بندگی کے ساتھ ہو، مخلوق سے کسی قسم کی توقع نہ رکھی جائے، مخلوق سے جزا کی توقع، تجارت ہے، سوداگری ہے نہ تو عبادت ہے اور نہ ہی بندگی ہے۔

حقیقی معنوں میں "بندہ خدا" وہ ہے جو ہمیشہ خود کو خدا کے حضور میں حاضر سمجھے اور خدا کے سوا کسی کو نہ دیکھے، حضور پیغمبر ختمی مرتبت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کو قرآن مجید میں "عبد" (بندہ) کے ساتھ ملقب کیا گیا ہے۔

حضرت علی عَلَیْہِ السَّلَام اپنی زندگی کو آغاز سے اختتام تک عبادت کے لئے وقف کر دیا تھا، خدمت خلق کے لئے وقف کر دی تھی، اس لئے کہ خدمت خلق برائے خدا عبادت ہے، بندگی خواہشات نفسانی کو پس پشت ڈال کر رضائے الٰہی کو اختیار کرنے کا نام ہے، عبادت، خدا کو پکارنے اور حضرت حق سے راز و نیاز کرنے اور اس کی بارگاہ اقدس میں سر تسلیم خم کرنے کا نام ہے۔ عبادت خود سے کٹ کر "خدا" سے جا ملنے کا نام ہے، "مَن" کو فراموش کر کے "اسے" اپنانے کا نام

ہے، عبادات میں سے کچھ ایسے وظائف بھی خدا کی طرف سے مقرر کئے گئے ہیں جنہیں شب و روز، نہاں و عیاں طور پر انجام دیا جانا چاہیے، انفرادی اور اجتماعی دونوں صورتوں میں۔

عبادت، خدا کی ذات تک پہنچنے کا سیدھا راستہ ہے اور اس کا دریچہ دل میں کھلتا ہے اور رفتار و گفتار پر جا کر ختم ہو جاتا ہے، یقینا انسان کے اعضاء میں سے ہر ایک عضو کے لئے خدا تک رسائی کا ایک راستہ ہے اور انسان کے خدا تک پہنچنے کے راستے کا پہلا قدم اس کی "بندگی" ہے۔

نماز تمام عبادتوں سے افضل عبادت ہے اور یہ بارگاہ حق میں حاضری دینے اور شرفیابی حاصل کرنے پر مشتمل ہے، خدا کے ساتھ گفتگو پر مشتمل ہے، خدا کی گفتگو پر مشتمل ہے، خضوع و خشوع اور اطاعت و تسلیم پر مشتمل ہے۔

حضرت علی علیہ السلام تمام نمازیوں کے سردار تھے اور خود ایسے نمازی تھے جو خود کو نہیں خدا کو دیکھتے تھے۔

ایک یہودی عالم مولا کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یا علیؑ! آپ نے اس خدا کو دیکھا بھی ہے جس کی عبادت کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: میں ایسے خدا کی عبادت نہیں کرتا جسے دیکھا نہ ہو! پوچھا خدا کو کیسے دیکھا؟ فرمایا: خدا کو ان ظاہری آنکھوں سے نہیں بلکہ دیدہ بصیرت اور بینش قلب سے اسے دیکھا جا سکتا ہے۔ (کافی جلد ۱ ص ۹۸، بحار الانوار جلد ۴۱ ص ۱۶،۱۵)

جامی کا قطعہ شعر

عبدالرحمان جامی نے حضرت علی عَلَیہِ السّلام کی نماز کے بارے میں ایک قطعہ شعر کہا ہے کہ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "جنگ احد میں حضرت علی عَلَیہِ السّلام کو ایک تیر لگا جو ان کے بدن میں پیوست ہو گیا، تیر کے نکالنے کی جتنا کوشش کی گئی مگر درد کی وجہ سے آپؑ سے تیر کو نہ نکالا جا سکا، اس لئے کہ آپ سے تکلیف برداشت نہیں ہو سکتی تھی، لیکن جب نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے تو تیر کو آسانی کے ساتھ نکال لیا گیا، اور آپ کو درد کا احساس تک نہ ہوا، کیونکہ علی عَلَیہِ السّلام اپنے آپ سے بے خود ہو کر "اسی" ہی کے ہو چکے تھے (تحفۃ الاحرار جامی، جو عبدالرحمان جامی کا دیوان کامل ہے ص۹۹)

نہج البلاغہ میں حضرت کے اپنے رب کے ساتھ مناجاتیہ کلمات منقول ہیں کہ "بارالہا! میں تیری عبادت تیری جہنم کے خوف سے یا تیری جنت کے لالچ میں نہیں کرتا، بلکہ تجھے لائق عبادت سمجھ کر تیری عبادت کرتا ہوں (بحارالانوار جلد ۷۰ ص۱۸۶، عوالی اللئالی ابن ابی جمہور جلد ا ص ۲۰۴)

ضرار نہشلی (ضرار بن ضمرہ ضبابی) نے امیر شام کے سامنے مولا علیؑ کی ان الفاظ کے ساتھ توصیف کی "جب علی عَلَیہِ السّلام ہمارے درمیان تھے بالکل ایسے کہ جیسے وہ ہم میں سے ہوں، ان کی خدمت میں پہنچنا ہر شخص کے لئے آسان تھا، کبھی آپ عَلَیہِ السّلام نے لوگوں کے لئے دروازہ بند نہیں کیا نہ کوئی دربان کھڑا

کیا، ہم سے نزدیک ہونے کے باوجود ان کی عظمت ہمارے دلوں میں جاگزیں تھی، اسی وجہ سے ہم ان سے بہت کم گفتگو کر سکتے تھے، ان کے لبوں پر ایسی مسکراہٹ تھی جس میں شرینی اور ملاحت پائی جاتی تھی، مہر و محبت اور کرم و رحمت کی مسکراہٹ، علی عَلَیہِ السَّلام شب زندہ دار بھی تھے کبھی رات کو تلاوت قرآن میں مشغول ہوتے تو کبھی دن کو۔

ایک مرتبہ آدھی رات کے وقت میں نے آپ کو محراب عبادت میں دیکھا جیسے کسی مار گزیدہ کی حالت ہوتی ہے، پیچ و تاب کھا رہے تھے، مصیبت زدوں کی مانند گریہ کر رہے تھے، میں نے سنا وہ کہہ رہے تھے: اے دنیا! اے دلہنِ زیبا!! تو اب میرے پاس آچکی ہے اور مجھے اپنا دیدار کرا رہی ہے، تو مجھ سے دور ہو جا!، پرے ہٹ جا!! مجھے تیری کوئی ضرورت نہیں ہے، میں نے تجھے تین طلاقیں دے دی ہیں، جس کے بعد تیری طرف رجوع ناممکن ہے"

اس کے بعد فرمایا: ہائے افسوس ہے مجھ پر سفر بہت دور و دراز ہے، زادراہ کم ہے، سفر کی سختیاں بہت زیادہ ہیں (بحارالانوار جلد ۴۰ ص ۳۳۰،۳۲۹ نہج البلاغہ حکمت ۷۷)

نوف بِکالی کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں ساری رات امیر المومنین عَلَیہِ السَّلام کے ساتھ صبح تک رہا، میں نے ساری رات دیکھا کہ آپ عبادت خدا میں مشغول رہے، کبھی آپ باہر تشریف لے جاتے، آسمان کی طرف دیکھتے پھر واپس آجاتے قرآن پاک کی تلاوت فرماتے، ایک دفعہ پوچھا نوف بیدار ہو یا سو رہے ہو؟ میں

نے عرض کیا: "امیر المومنین ! جاگ رہا ہوں" فرمایا: "خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو دنیا سے بے خبر ہو کر آخرت کی فکر میں لگے ہوئے ہیں، انہوں نے زمین کو اپنے لئے بستر قرار دیا ہوا ہے، مٹی کو اپنا بچھونا بنایا ہوا ہے، پانی کو اپنے لئے لذیذ غذا سمجھا ہوا ہے، قرآن اور دعا کے ساتھ لو لگائی ہوئی ہے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح دنیا کو پشت کئے ہوئے ہیں (بحار الانوار جلد ۴۱ ص ۱۶)

حضرت علی علیہ السلام ہی فرماتے ہیں: "جب سے میں نے رسول گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ "نماز شب" (تہجد) نور ہے تو میں نے نماز شب کبھی ترک نہیں کی" اس موقع پر ابن کوا نے گستاخانہ لہجے میں پوچھا: حتیٰ کہ "لیلۃ الہریر" میں بھی اسے نہیں چھوڑا؟، فرمایا: حتیٰ کہ لیلۃ الہریر میں بھی اسے ترک نہیں کیا۔ (بحار الانوار جلد ۴۱ ص ۱۱)

(نوٹ: لیلۃ الہریر جنگ صفین میں وہ رات ہے جس میں امیر المومنین علیہ السلام ساری رات جنگ میں مصروف رہے لیکن نماز تہجد کو ترک نہیں کیا)

منقول ہے کہ آنجناب نے کھجوروں کے پانچ سو درخت کاشت کئے ہوئے تھے اور ہر رات ایک ایک درخت کے نیچے دو رکعت نماز ادا کرتے تھے (بحار الانوار جلد ۴۱ ص ۱۵)

علی علیہ السلام ایسے عبادت گزار تھے جو مسجد میں بھی نماز پڑھتے تھے، گھر میں بھی، اور نخلستان میں بھی، کیونکہ عبادت صرف مسجدوں کے ساتھ مخصوص نہیں، پورا کرہ ارض عبادت گاہ ہے، عیسائیوں کے نزدیک عبادت ایک خاص قسم

کے رکھ رکھاؤ کا نام ہے، ان کا بندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور وہ حضرت عیسیٰ مسیح عَلَیہِ السَّلام کی پیروی نہیں کرتے، وہ عبادت کی جگہ صرف کلیسا (چرچ) کو سمجھتے ہیں، اور وہ بھی ہفتے میں صرف ایک بار، جو مسلمان نماز باجماعت کو ایک رکھ رکھاؤ کی عبادت جانتے ہیں وہ علی عَلَیہِ السَّلام کے راستے کو نہیں اپناتے، حضرت مصطفیٰؐ کی پیروی نہیں کرتے، کیونکہ عبادت پہلے درجے میں ایک روحانی معاملہ ہے اور ایسی بندگی ہے جو دل سے سر اٹھاتی ہے، اس کے بعد وہ باہر ظاہر ہوتی ہے رکھ رکھاؤ والی عبادت عبادت نہیں کہلاتی، بندگی نہیں کہلاتی۔

علی عَلَیہِ السَّلام کا طریقہ کار

ارباب فکر و نظر اور صاحبان دانش و بینش کے درمیان اس بات میں اختلاف ہے کہ: "آیا کسی نیک مقصد کے حصول کے لئے ہر ذریعے اور وسیلے کو اختیار کیا جاسکتا ہے چاہے وہ وسیلہ نیک اور مقدس نہ بھی ہو؟ آیا مقصد کا نیک ہونا خود وسیلے اور ذریعے کے تقدس کا سبب بن سکتا ہے؟

یعنی اگر گناہ کو کسی نیک مقصد کا ذریعہ قرار دیا جائے تو وہ پھر بھی گناہ رہے گا؟

تو اس بارے میں لفٹسٹوں (یعنی بائیں بازو والی جماعتوں) اور کمیونسٹوں کا نظریہ یہ ہے کہ مقصد کے حصول کے لئے خواہ کوئی بھی ذریعہ اختیار کیا جائے جائز اور صحیح ہے، خواہ وہ کیمونزم کے مفادات کے خلاف ہی ہو۔

مقصد اور ذریعہ

دوسری جنگ عظیم میں کمیونسٹوں نے اپنے دشمن یعنی آمریت کا رجحان رکھنے والے فاشسٹوں کو تقویت پہنچائی، اس کے بعد سرمایہ داروں سے اتحاد کر لیا، حالانکہ فاشسٹوں اور سرمایہ داری کی تقویت کیمونزم کے نزدیک صرف گناہ ہی نہیں بلکہ گناہ عظیم ہے۔

انقلاب کے نام پر دہشت گردی، موت کی سزائیں، تخریب کاری، بے گناہوں کو یرغمال بنانا، انہیں موت کے گھاٹ اتارنا، یہ سب اسی نظریے کی پیداوار ہے یعنی مقصد کے حصول کے لئے کوئی بھی راستہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔

لیکن علی عَلَیْہِ السَّلَام کا راستہ ایسا نہیں تھا بلکہ آپ عَلَیْہِ السَّلَام نے دوسری راہ کو اختیار کیا اپنی تمام عمر میں آپ نے گناہ کے کسی راستے کو اپنی کامیابی کا ذریعہ قرار نہیں دیا، حالانکہ اگر چاہتے تو ایسا کر سکتے تھے مگر نہیں کیا، انسانیت قدرت رکھنے کے باوجود ایسا نہ کرنے اور عدل، گناہ سے بچ کر رہنے کا نام ہے۔

علی عَلَیْہِ السَّلَام کے نزدیک حق کی راہ کو بھی حق ہونا چاہیے، باطل کی راہ چل کر حق تک پہنچنا غلط ہے ناروا اور ناجائز ہے۔

آپ خود ارشاد فرماتے ہیں:

"اَتَامُرُونِی اَن اَطلُبَ النَّصرَ بِالجَورِ فِی مَن وُلِیتُ عَلَیہِ وَاللهِ مَا اَطُورُ بِہٖ مَا سَمَرَ سَمِیرٌ وَ مَا نَجم فِی السَّمَاءِ نَجِما" (نہج البلاغہ خطبہ ۱۲۶)

یعنی تم مجھے کہتے ہو کہ میں ظلم و ستم کے ذریعے کامیابی حاصل کروں! خدا کی قسم میں تا قیامت ایسا نہیں کروں گا۔

علی عَلَیہِ السّلام کے نیک مقصد تک پہنچنے کے لئے گناہ کے راستے کو اختیار نہیں کیا جا سکتا اور اگر ایسا کیا جائے تو مقصد کا تقدس ختم ہو جائے گا، اس راہ میں ذریعہ، مقصد سے جدا نہیں ہے، مقصد اور ذریعہ دو مختلف چیزیں نہیں ہیں بلکہ یک جان دو قالب ہیں، یہ ذریعہ بھی در حقیقت مقصد ہی ہے۔

ظلم و ستم کے ذریعہ عدل و انصاف کو قائم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ صحیح نہیں اس لئے کہ یہ ظلم کا قیام ہو گا عدل کا نہیں، حق تک پہنچنے کے لئے گناہ سے مدد لی جائے حقیقت میں حق سے انحراف ہے، ظلم کے ذریعے عدل کو طلب کرنا، عدل سے گریز اور حق کے لئے سد راہ ہے، خوبصورتی کو بد صورتی کے ذریعے حاصل نہیں کیا جا سکتا، محال ہے کہ "عدم" کو "وجود" کا سبب قرار دیا جائے۔ دھوکہ بازی کو کبھی نیکی کا نام نہیں دیا جا سکتا، اور نہ ہی خیانت کو امانت کہا جا سکتا ہے، ذریعہ مقصد کا جز ہے اور حکم میں دونوں کا نقیض ہونا محال ہے۔

مقصد کا تقدس، ذریعہ کے تقدس کے ساتھ ساتھ ہے، دونوں ایک دوسرے کے لازم ملزوم ہیں، برتن سے وہی ٹپکتا ہے جو اس کے اندر ہوتا ہے۔

جو شخص گناہ کو مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھتا ہے وہ صرف اپنی ذات کو پیش نظر رکھتا ہے نا کہ مقصد کو، ورنہ ہر ایک کو معلوم ہے کہ باطل کبھی حق کا لازمہ نہیں ہو سکتا اور ظلمت کو نور نہیں کہا جا سکتا۔

کر سکتے تھے مگر نہیں کیا

مورخین کا اتفاق ہے کہ حضرت علی علیہ السلام خود کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا برحق خلیفہ سمجھتے تھے اور دوسروں کو اس کا حقدار نہیں جانتے تھے، لیکن کسی گناہ کے ذریعے اپنے اس ہدف کو حاصل نہیں کرنا چاہتے تھے حالانکہ اگر چاہتے تو کر سکتے تھے مگر نہیں کیا، اپنی طاقت کا مظاہرہ کر کے حکومت کا تختہ الٹ سکتے تھے لیکن ایسا نہیں کیا،

اگر چاہتے تو رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غسل اور تجہیز و تکفین کو مؤخر کر کے سقیفہ بنی ساعدہ میں شرکت کر کے خلیفہ بننے والے کو ایک طرف کر کے مہاجرین میں سے خلافت کا امیدوار بن کر بلا مقابلہ خلیفہ بن سکتے تھے لیکن ایسا نہیں کیا، مدینہ سے باہر جا کر مسلمانوں کو اکٹھا کر کے مدینہ پر حملہ کر سکتے تھے لیکن نہیں کیا، منطقی گفتگو کے علاوہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے کوئی اور ذریعہ اختیار نہیں کیا، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی میں لوگوں کی خلافت کے حاصل کرنے کے لئے مخفی چالوں اور سازشوں سے واقف تھے۔ لیکن کسی کو کچھ نہیں کہا،

اگر آپ اپنے سے پہلے خلفاء کے دور حکومت میں تخریب کاری سے کام لینا چاہتے تو کر سکتے تھے انہیں کوئی روکنے والا نہیں تھا، جس طرح خود ان کے اپنی حکومت کے دور میں حاکم شام نے تخریب کاری کی، اور آپ کی رعایا کا سکون

غارت کیا ہوا تھا، مگر آپ نے ایسا نہیں کیا، بلکہ کفر کے مقابلے میں ان کی مدد اور رہنمائی بھی کی، علی عَلَیہِ السَّلام کی پوری سوانح عمری کی داستانیں ہمارے اس دعوے کی شاہد ناطق ہیں۔

علی عَلَیہِ السَّلام اگر چاہتے تو خلیفہ ثانی کو غلط راستے کی راہنمائی کر سکتے تھے تاکہ اس طرح سے ان کے خلافت کی راہیں تنگ ہو جائیں اور وہ استعفیٰ دینے پر مجبور ہو جائیں، مگر ایسا نہیں کیا، اور ان کی اس قدر راہنمائی کی، وہ کئی مرتبہ "لولا علی لھلك عمر" کہنے پر مجبور ہو گئے، کہ اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔

اگر علی چاہتے تو حضرت ابو بکر کی اس وصیت کا کچا چٹھا بھی کھول سکتے تھے کہ جس کی وجہ سے انہوں نے حضرت عمر کو اپنی خلافت کے لئے جانشین مقرر کیا تھا کیونکہ ان کی یہ وصیت رسول خدا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کی سنت کے خلاف تھی اس لئے کہ بقول خود ان حضرات کے رسول خدا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے اپنی خلافت کے بارے میں کوئی وصیت نہیں کی تھی۔

شوریٰ کی تشکیل کے بعد اگر علی عَلَیہِ السَّلام چاہتے تو عبد الرحمن بن عوف کو راضی کر کے انہیں کے ساتھ خلافت کا معاہدہ کر کے خلافت کا تخت سنبھال لیتے اور خلافت کے خوب مزے لوٹتے (جس طرح حضرت عثمان نے کیا) لیکن آپ عَلَیہِ السَّلام نے ایسا نہیں کیا۔

عبد الرحمن بن عوف کی پیش کش کے جواب میں صرف "ہاں" ہی تو کہنی تھی مگر نہیں کیا، اور ایک طرف ہو گئے، کہہ تو سکتے تھے اور جب خلافت کی

باگ ڈور سنبھال لیتے اور وعدوں اور خوشخبریوں کے ذریعے طلحہ و زبیر کو مقام و منصب عطا فرما دیتے اور سپاہ جمل کی تشکیل اور جنگ جمل کی آتش افروزی سے خود کو بچا لیتے، لیکن ایسا نہیں کیا، اگر چاہتے تو بیت المال کے روپے پیسے کو اندھوں کی ریوڑیوں کی طرح پیسہ پرستوں کے درمیان لٹا دیتے اور انہیں خوش رکھتے مگر ایسا نہیں کیا۔

اگر علی عَلَیہِ السَّلام کا طریقہ کار ایسا ہوتا تو یقین جانیئے کہ آپ کا کوئی ایک شخص بھی مخالف نہ ہوتا، کیونکہ "عدل" کے مخالف ہی آپ کو پسند نہیں کرتے تھے، کیونکہ آپ رشوت میں کسی کو کوئی روپیہ پیسہ نہیں دیتے تھے، عہدہ اور منصب عطا نہیں کرتے تھے، اگر کسی کو دیا اس کی اپنی لیاقت اور شائستگی کی بنیاد پر دیا، جسے آج کل کی اصطلاح میں "میرٹ" کہتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ناہنجار لوگ آپ کے دشمن ہو گئے اگر علی عَلَیہِ السَّلام بھی ان لوگوں سے ویسا سلوک کرتے جو دوسرے حکمران کرتے تھے تو وہ بھی سر کے بل آپ کے پیچھے دوڑے پھرتے ہوتے، کسی اور کے پیچھے نہ جاتے۔

عمرو بن عاص پہلے تو آپ کے پاس آیا لیکن جب اسے وہاں سے کچھ نہ ملا تو پھر حاکم شام کے پاس چلا گیا، اگر علی عَلَیہِ السَّلام اسے مصر کا گورنر بنا دیتے تو وہ کبھی آپ سے جدا نہ ہوتا بلکہ امیر شام کے دشمنوں میں سے ہوتا۔

مغیرہ بن شعبہ پہلے تو علی عَلَیہِ السَّلام کے پاس آیا جب وہاں سے ناامید ہو گیا تو امیر شام کے پاس چلا گیا۔

اگر علی چاہتے تو کسی ایک یا کئی دہشت گردوں کو شام بھیج کر معاویہ کا کام تمام کرا دیتے، لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا، جنگ صفین میں لشکر شام پر دریا کا پانی بند کر دیتے مگر ایسا نہیں کیا، اگر چاہتے تو شامی فوج پر شب خون مار کر اسے اٹھنے کے قابل ہی نہ چھوڑتے لیکن ایسا نہیں کیا، خوارج سے نعوذ باللہ جھوٹ بول کر انہیں دھوکہ میں ڈال کر زبان پر لفظ "توبہ" لا کر انہیں خاموش کرا دیتے لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔

حضرت علی کی شہادت

حضرت علی عَلَیہِ السّلام کی شہادت تاریخ انسانیت میں عدل و انصاف کا ایک مجسم نمونہ تھی جیسا کہ آپ کی زندگی عدل تھی اسی طرح آپ کی وفات بھی عدل تھی اور آپ خود متضاد صفات کے مجموعہ تھے۔

حضرت علی عَلَیہِ السّلام کی شہادت کو "موت "نہیں کہا سکتے بلکہ یہ شہادت "حیات "سے بھی بالاتر حیات تھی، جبکہ دنیا والے آپ عَلَیہِ السّلام کی شہادت کو موت سمجھتے ہیں، جو ہر ایک فرد بشر کو آتی ہے لیکن جو موت عدل کا نمونہ بن جائے وہ صرف علی عَلَیہِ السّلام کی ہی موت تھی اور بس، ایسی موت کہ جس کی تمام "اموات "میں نظیر نہیں ملتی وہ علی عَلَیہِ السّلام ہی کی بے نظیر موت تھی، یعنی جس طرح آپ کی حیات بے نظیر تھی اسی طرح موت بھی بے نظیر تھی، حضرت علی عَلَیہِ السّلام اپنے قاتل کو اچھی طرح جانتے تھے اور اس کے ارادے سے بھی آگاہ تھے، آپ اسے قتل بھی کر سکتے تھے، زندان میں بھی ڈال سکتے تھے، اور کچھ نہیں کم از کم اسے شہر بدر بھی کر سکتے تھے۔ اس طرح سے آپ اپنی جان کو بچا سکتے تھے، لیکن عدل کا تقاضا یہ نہیں تھا کہ کسی کو جرم کے ارادے پر سزا دی جائے۔

ایک دن آپ کسی حمام میں نہا رہے تھے تو آپ کو اپنے دونوں صاحبزادوں جناب حسنین شریفین کی بلند آواز کپڑے اتارنے کی جگہ سے سنائی دی، تو آپ حمام سے باہر آ گئے، پوچھا! یہاں کیا کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا: "ہم نے دیکھا کہ یہ فاجر

ابن ملجم چھپ کر آپ کا پیچھا کر رہا ہے، اور ہمیں اس سے آپ کی جان کا خطرہ ہے لہٰذا ہم آپ کی حفاظت کے لئے آئے ہیں۔

حضرت عَلَیہِ السَّلام نے فرمایا: " تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیے

(بحار الانوار جلد ۴۲ ص ۱۹۷)

تاریخ انسانیت میں علی عَلَیہِ السَّلام کا قتل عظیم ترین انسانی جرم ہے اور آپ کا قاتل تاریخ بشریت کا عظیم ترین مجرم ہے، اس لئے کہ یہ قاتل ایسا شخص ہے جس نے اپنے مولا علی عَلَیہِ السَّلام سے کوئی دکھ نہیں دیکھا، کوئی رنج نہیں دیکھا، کوئی تلخ کلامی نہیں دیکھی، بلکہ علی عَلَیہِ السَّلام اس کے لئے سراپا مہر و محبت تھے، سر تا پا خیر ہی خیر تھے، نفع ہی نفع تھے، مگر وہ ہے جو انسانیت کے لئے جرم کا مرتکب ہوا اور وہ بھی مسجد میں ماہ رمضان میں اور شب قدر میں۔ لعنت ہے ایسے انسان پر، لعنت ہے ایسی پلید سوچ پر، تفو بر اے چرخ گردون تفو۔

۱۹ ماہ رمضان ۴۰ ہجری میں سحر کے وقت مسجد کوفہ میں اس جرم کا ارتکاب کیا گیا، کائنات کے بہترین انسان کے سر اقدس پر تلوار کی ضربت کے ساتھ اسے خاک و خون میں نہلا دیا گیا۔ کائنات کے بدترین شخص کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

امام عَلَیہِ السَّلام تین دن تک زندہ رہے اگر اس دنیا سے رخصت نہ ہوتے تو اپنے ضرب مارنے والے کو یقینا معاف کر دیتے، ان تین دنوں میں اپنے قاتل کے بارے میں سفارش کرتے رہے کہ: مبادا اس پر تشدد کیا جائے، اسے مارا

پیٹا جائے، اسے کوئی گالی دی جائے، اگر قصاص لینے کی ضرورت ہو تو تلوار کے صرف ایک ہی وار کے ساتھ قتل کیا جائے، کیونکہ اس نے بھی مجھے ایک ضربت لگائی ہے، قاتل سے قصاص لینا شہید کا حق نہیں ہوتا اس کے ورثاء کا حق ہوتا ہے، زندہ رہ جانے والوں کا حق ہوتا ہے کیونکہ انسانی حیات کا تعلق انہیں سے ہوتا ہے۔ آپ نے بنی ہاشم کو ان الفاظ کے ساتھ وصیت فرمائی "کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کہنے لگ جاؤ کہ امیر المومنین عَلَیہِ السَّلام کو قتل کیا گیا ہے اسی وجہ سے دوسروں کا خون بہانا شروع کر دو، اور آدم کشی پر اتر آؤ" (بحارالانوار جلد ۴۲ ص ۲۳۹)

اس قسم کی وصیت سے شاید آپ کا مقصد "عربی انتقام" سے روکنا ہو، کیونکہ یہ ایسا انتقام ہوتا ہے جس سے قاتل کے تمام رشتہ داروں کا خون ہر حالت میں مقتول کے تمام ورثاء کے لئے روا ہوتا ہے اور یہ سلسلہ سال ہا سال تک چلا جاتا ہے۔

کوتاہ فکر افراد کی علی عَلَیہِ السَّلام کے ساتھ دشمنی اس حد تک تھی کی آپ کی شہادت کے بعد آپ کی قبر کے ساتھ بھی ان کو دشمنی تھی، لیکن علی عَلَیہِ السَّلام نے ان کے قتل سے روک دیا۔ یہ علی عَلَیہِ السَّلام کی عدالت کا نمونہ، دشمن کے ساتھ علی عَلَیہِ السَّلام کی مہر و محبت کا نمونہ۔

آپ عَلَیہِ السَّلام کا جنازہ رات کو اٹھایا گیا اور ایک ایسے مقام پر تدفین کے لے جایا گیا جسے کوئی نہ جانتا تھا، اور وہیں پر آپ کو سپرد خاک کیا گیا۔ علی عَلَیہِ السَّلام خدا کے

گھر میں خانہ کعبہ میں پیدا ہوئے اور خدا کے گھر میں مسجد کوفہ میں شہادت پائی، یہ علی عَلَیہِ السَّلام کی زندگی کا خلاصہ

خدا کے گھر ہی سے آئے — خدا کے گھر ہی سے اٹھے

ولادت ہو تو ایسی ہو — شہادت ہو تو ایسی ہو

حیات علی عَلَیہِ السَّلام کا آغاز بھی خدا کے گھر سے ہوا اور اختتام بھی خدا ہی کے گھر میں ہوا، کیونکہ علی ہمیشہ خدا کے ساتھ رہتے تھے اور خدا کے ساتھ رہے کبھی اس سے جدا نہیں ہوئے۔

کسے را میسر نشد این سعادت

بکعبہ ولادت بمسجد شہادت

علی عَلَیہِ السَّلام کا جنازہ دشمن کے خوف سے رات کو اٹھایا گیا اور رات ہی میں سپرد خاک کیا گیا، لعنت ہے ایسے جاہل انسانوں پر۔

انسانوں کا نجات دہندہ، انسانوں کو زندگی بخشنے والا، انسانوں کا خدمت گزار، انسانوں کو آسائش بخشنے والا، انسان ہی کے ہاتھوں مارا جائے، انسانوں کے خوف سے اس کا جنازہ رات کو اٹھایا جائے اور راتوں رات سپرد خاک کیا جائے، لعنت ہے ایسے انسانوں پر۔

علی عَلَیہِ السَّلام کی ساری زندگی کا تعلق رات کے ساتھ رہا، تو آپ کی موت کا تعلق بھی رات سے تھا، رات کو ضربت کھائی، رات کو اسی دنیا سے رخصت ہوئے اور رات ہی کو سپرد خاک کئے گئے آیا رات کو دن پر فضیلت ہے ؟!!

حضرت علی عَلَیہِ السّلام کے جنازے کی مشایعت کرنے والوں میں آپ کے فرزند اور ایک دو آپ کے دوست تھے اور جنازہ کو ایک نامعلوم جگہ میں دفن کیا گیا، اسی دوران میں آپ کے ایک باوفا دوست صعصہ بن صوحان آگے بڑھے، اپنا ایک ہاتھ دل پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی مٹھی میں مٹی اٹھا کر اپنے سر میں ڈال کر اپنے مولا عَلَیہِ السّلام کی خدمت میں عرض کرنے لگے:

"میرے ماں باپ آپ پر قربان جائیں یا امیر المومنین عَلَیہِ السّلام !خوش قسمت ہیں آپ یا ابا الحسن عَلَیہِ السّلام ! آپ پاک و پاکیزہ اس دنیامیں تشریف لائے، پاک و پاکیزہ زندگی گزاری اور پاک و پاکیزہ حالت میں اس دنیا سے جارہے ہیں، بے مثال طریقہ پر اپنے مشن پر ڈٹے رہے، جہاد میں ثابت قدم رہے، جو چاہتے تھے اسے انجام دیا، خدا کے ساتھ سودا کیا اور فائدہ میں رہے آخر کار حق کے دیدار کا شرف حاصل کر لیا، اس کے فرشتوں نے آپ کو اپنے حلقے میں لے کر نہایت ہی بہترین انداز میں آپ کا استقبال کیا، اس نے آپ کو بہترین جگہ میں پناہ دی، یا ابا الحسن عَلَیہِ السّلام! آپ اس مقام پر پہنچ گئے جہاں پر آپ کے بھائی حضرت محمد مصطفیٰ پہنچے ہوئے ہیں، اب آپ ان کے پاس پہنچ چکے ہیں اور ذات حق کے لبریز اور سرشار جاموں سے سیر اب ہو چکے ہیں،

میری خدا سے درخواست ہے کہ وہ ہم پر مہربانی فرمائے کہ ہمیں صحیح معنوں میں آپ کا پیروکار بنائے اور ہم آپ کے نقش قدم پر چلتے رہیں، ہمیشہ

آپ کے دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے دشمن رہیں، میری خدا سے استدعا ہے کہ ہمیں آپ کے دوستوں میں محشور فرمائے۔

یا امیر المومنین علیہ السلام! آپ اس مقام تک پہنچ چکے ہیں جہاں آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا، آپ ایسے ایمان کے مالک ہیں جو دوسروں کے نصیب نہیں ہو سکا، آپ نے اللہ کی راہ میں اور اپنے برادر جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور میں جہاد کیا، خدا کی سنتوں کو قائم کیا، ہر قسم کی بد امنی اور فتنہ و فساد کی سرکوبی فرمائی، تا ایں کہ اسلام قائم ہو گیا، اور ایمان کو ترقی ملی، میرا بہترین درود و سلام ہو آپ پر۔

یا امیر المومنین علیہ السلام ! آپ امت کے بہترین محافظ تھے، راہ حق کے چراغ راہنما تھے، جو فضائل و مناقب اللہ نے آپ کو عطا فرمائے وہ کسی اور میں دیکھے نہیں گئے، آپ پہلی وہ شخصیت ہیں جس نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہا۔ اسلام کی راہ میں قدم اٹھایا اور جان کی قربانی دی، حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد کی، اپنی جان کے ذریعے رسول اسلام کا دفاع کیا۔

یا علی علیہ السلام! آپ پہلی وہ شخصیت ہیں جس نے خطرناک ترین جنگوں میں تن تنہا جانبازی کے جوہر دکھائے، اللہ نے آپ کے ذریعہ آپ کی شمشیر ذوالفقار کے ساتھ بڑے بڑے مغروروں اور سرکشوں کے غرور کو خاک میں ملایا، مشرکین کے مضبوط قلعوں کو، کفر کی محفوظ فصیلوں کو اور دشمنان حق کی سر بفلک عمارتوں کو تہس نہس کر دیا۔

یا امیر کائنات! آپ جیسا خوش قسمت کون ہو سکتا ہے کہ جو رسول خداﷺ کے سب سے زیادہ نزدیک ہو؟ آنحضرتﷺ کا عقل مند ترین، دانشمند ترین ساتھی ہو؟ خالق کائنات نے آپ علیہ السلام کو بلند ترین مقام اور بالاترین منزلت عطا فرمائی ہے، آپ کی دلیری سب دلیروں سے فائق، راہ خدا میں آپ علیہ السلام کی جانبازی سب سے زیادہ پیشگام اور خیر وسعادت تک رسائی سب سے زیادہ نمایاں تھی، آپ کے اسلام کو دیگر مسلمانوں کے اسلام پر برتری حاصل ہے، آپ کا یقین دیگر یقینوں پر فوقیت رکھتا ہے، خداوند عالم آپ کے بعد ہمیں اپنے اجر سے اور آپ کی دوستی سے محروم نہ فرمائے اور نہ کبھی ہمیں ذلت کا سامنا کرنا پڑے۔

خدا کی قسم! آپ کی حیات ہر خیر کی کنجی، اور ہر شر کے لئے تالے کی حیثیت رکھتی ہے، آپ کی موت سے شر کے دروازے کھل گئے، اور رحمت کے دروازے بند ہو گئے، اگر سب لوگ آپ کی اطاعت کرتے تو ان پر آسمانوں کے اوپر سے اور زمین کے نیچے سے نعمتوں کے دروازے کھل جاتے۔

آخر میں صعصہ نے ایک جگر خراش بین کے ساتھ رونا شروع کر دیا اس حد تک دردناک بین تھا کہ تمام حاضرین گریہ کرنے لگ گئے، پھر سب نے مل کر اولاد علی علیہم السلام کو تعزیت اور تسلیت پیش کی۔(بحارالانوار جلد ص۲۵۶تا۲۵۹)

حضرت علی علیہ السلام نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور آپ کی خدمت میں لوگوں کے رویہ کی شکایت کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "یا علی علیہ السلام ! آپ ان لوگوں پر نفرین کریں! تو علی علیہ السلام نے بارگاہ رب العزت میں عرض کیا: "پروردگارا! میری راہ ان لوگوں سے واپس لے لے اور انہیں مجھ سے بدترین لوگ عطا کر" (بحارالانوار جلد ۴۲ ص ۲۰۶ تا ۲۰۷)

میں نہیں سمجھتا کہ تاریخ بشریت میں کسی کے بارے میں اس سے بدترین نفرین ہو ،البتہ وہ بشر جو اس قسم کی نعمت کی لیاقت کے حامل نہیں ہوتے ان سے یہ نعمت لے لی جاتی ہے، جو نعمت کسی کو ملے حتیٰ الامکان اس کی حفاظت کرنی چاہیے، ورنہ آپ کو معلوم ہے کہ "زمانہ گلچین ہوتا ہے علی علیہ السلام جیسے سعادت بشریت کے گل سبد کو بھی چن کر لے گیا اور وہ بھی خود ایک بشر کے ہاتھوں، برا حال ہو ایسے انسانوں کا جو اپنے ہاتھوں سے اپنی ہی سعادت اور خوش بختی کا ملیامیٹ کر دیتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے سلسلے میں اہم چند نکات

۱۔ کسی جرم کا اراہ کسی کے مجرم ہونے کا سبب نہیں ہوتا ، حضرت علی علیہ السلام ابن ملجم کے ارادے سے آگاہ تھے اور کئی دوسرے لوگ بھی آگاہی رکھتے تھے اور اسے پہنچانتے بھی تھے، لیکن حضرت امیر علیہ السلام اسے جرم سے پہلے مجرم نہیں سمجھتے تھے، اسی لئے نہ تو اسے قید کیا، نہ شہر بدر کیا اور نہ ہی اس کی خفیہ نگرانی کی، بلکہ اسے بالکل آزاد چھوڑ رکھا تھا۔

۲۔ قصاص کے نقطہ نظر سے آپ نے ابن ملجم کے لئے سزائے موت کا حکم جاری نہیں کیا بلکہ فرمایا: "اگر میں اس دنیا سے چلا گیا تو تم نے اسے صرف ایک ضرب مارنی ہے خواہ وہ اس کے بعد زندہ رہے یا مر جائے، کیونکہ اس نے مجھے صرف ایک ہی ضرب ماری تھی، یہ نہیں فرمایا کہ: اس نے مجھے قتل کیا ہے لہٰذا تم بھی اسے قتل کر دینا"

۳۔ اشعث بن قیس قتل کی اس سازش میں شریک تھا لیکن حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد اسے کسی نے کچھ نہیں کہا، کیونکہ وہ انیس رمضان کی رات ابن ملجم کے ساتھ مسجد میں موجود تھا، بوقت سحر حضرت علی علیہ السلام نے اسے بھی بیدار کیا اور فرمایا: اٹھ جاؤ، اب کام کا وقت آن پہنچا ہے۔

حضرت حجر ابن عدی رضی اللہ عنہ اس وقت مسجد میں مشغول عبادت تھے، ابن ملجم کے ساتھ اشعث کی باتوں سے انہیں اس کے ارادے کا علم بھی ہو گیا اور اس

سے فرمایا: تم سمجھتے ہو کہ یہ کام کر سکو گے؟ پھر جلدی سے مسجد سے باہر چلے گئے تاکہ جناب امیر عَلَیہِ السَّلام کو اس کی سازش سے آگاہ کریں کہ وہ کس وقت حملہ کرے گا، لیکن جب آپ کے در اقدس پر پہنچے تو آپ عَلَیہِ السَّلام وہاں سے نکل چکے تھے اور دوسرے راستے سے مسجد بھی پہنچ گئے تھے اور جب وہ مسجد واپس آئے تو کام تمام ہو چکا تھا (مناقب آل ابی طالب جلد ۳ص ۳۱۲)

۴۔ حضرت امیر المومنین عَلَیہِ السَّلام کی شہادت کے بعد ابن ملجم کو قصاص کی غرض سے حضرت امام حسن مجتبیٰ عَلَیہِ السَّلام کی خدمت میں لایا گیا، قاتل نے آپ سے درخواست کی "مجھے آپ اپنے دشمن نمبر ایک حاکم شام کی طرف بھیج دیں اگر میں اسے قتل کر کے خود بھی مارا جاؤں تو آپ کو اپنا مقصد حاصل ہو جائے گا، اور اگر بچ گیا تو واپس آجاؤں گا تو اس وقت آپ مجھ سے قصاص لے لینا"

لیکن امام مجتبیٰ عَلَیہِ السَّلام نے اس کی پیشکش کو مسترد کر دیا اور دہشت گردی کو پروان چڑھانے سے صاف انکار کر دیا۔

بحمد للہ تمام شد، بروز شنبہ ۱۰ صفر ۱۴۴۰ھ مطابق ۲۰ اکتوبر ۲۰۱۸ء

بوقت ساڑھے تین بجے شب، بمقام جامعۃ الکوثر، اسلام آباد